معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپیے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپیے ۔ فی شمارہ سات روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ

ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحیی، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس۔ ایم۔ کالج، اسٹریچن روڈ، کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج — خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۶۷ ماہ ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ مطابق ماہ مارچ سنہ ۲۰۰۱ء عدد ۳

فہرست مضامین

شذرات

ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل قائم کرنے کے لئے عزم ہوا ڈاکٹر صبیح احمد کمالی مرحوم نے ایک خطیر رقم عطا کی تھی مگر اس کی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز اب موجودہ صدر شعبہ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کے زمانے میں وائس چانسلر جناب محمد حامد انصاری کی خاص دلچسپی سے ہوا ہے، سیل کے مقاصد میں شاہ ولی اللہؒ پر مفید لٹریچر کی اشاعت اور سالانہ بین الاقوامی سیمنار کا انعقاد بھی ہے، اس سال ۲۰ تا ۲۲ فروری کو اس کا پہلا بین الاقوامی سیمنار شاہ صاحب کی مہتم بالشان تصنیف حجۃ اللہ البالغہ پر ہوا جس کے افتتاحی جلسے کی صدارت محمد حامد انصاری صاحب وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کی،

انہوں نے شاہ صاحبؒ کو عظیم مفکر بتاتے ہوئے ان کے افکار و خیالات کے تجزیے پر زور دیا تاکہ فکر و عمل کے مقفل دروازے کھل سکیں، اس موقع پر انہوں نے حضرت شاہ صاحب پر محمد یٰسین صاحب کی مختصر تصنیف کا اجرا بھی کیا جس کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی اور عربی سید علیم اشرف جائسی نے کیا تھا، پروفیسر عبدالحق انصاری نے اپنے کلیدی خطبہ میں شاہ صاحب کو ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کی سب سے اہم شخصیت قرار دیا، اسلام آباد کی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے پروفیسر محمد الغزالی اڈیٹر الدراسات الاسلامیہ شاہ صاحبؒ کے نظریات کی معنویت و اہمیت دکھاتے ہوئے انہیں مستقبل کا مفکر بھی قرار دیا، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری بنارس، ڈاکٹر نسیم احمد سری نگر اور مولانا حبیب ریحان ازہری بھوپال کی تقریریں بھی ہوئیں، شروع میں پروفیسر عبدالعلی نے حاضرین کا خیر مقدم کیا اور صدر شعبہ نے سیمنار کے اغراض و مقاصد بتائے اس جلسے کی نظامت ڈاکٹر عبیداللہ فہد نے کی

افتتاحی جلسے کے بعد ہی مقالات خوانی کا پہلا جلسہ پروفیسر محمد الغزالی کی صدارت میں ہوا جس کی نظامت ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی نے کی، سب سے پہلے قرعہ فال میرے نام نکلا، میں نے حجۃ اللہ البالغہ کے حوالے سے علوم نبوی کے اقسام، طبقات کتب حدیث اور مختلف و متعارض حدیثوں میں شاہ صاحب

کے طریقہ کار کی وضاحت کی، اسی دن سہ پہر سے ۹ بجے شب تک مقالات کے دوسرے اور تیسرے جلسے ہوئے پھر دو روز تک مقالات خوانی کے چار چار جلسے مختلف اصحاب علم کی صدارت میں ہوئے یہ اعزاز مجھے بھی بخشا گیا، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد، جواہر لال نہرو دلی یونیورسٹی اور کشمیر یونیورسٹی، جامعہ سلفیہ بنارس، جامعۃ الفلاح بلریا گنج، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال اور دیوبند اور میرٹھ کے مدارس کے فضلا نے بھی مقالات پیش کئے، علی گڑھ کے شعبہ اسلامیات اور دوسرے شعبوں کے دانشوروں کے مقالات بھی ہوئے، ایران سے دو اور پاکستان سے پانچ مندوبین نے شرکت کی جن میں دو خواتین اور حافظ منیر احمد خاں حیدرآباد سندھ بھی تھے جن کا مقالہ قرآنی محاورات و استعارات معارف اپریل تا جولائی ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا تھا، مقالہ نگاروں کی تعداد تقریباً ساٹھ تھی، اس کی وجہ سے وقت کی تحدید تھی، تاہم اس کامیاب سیمنار سے حجۃ اللہ البالغہ کے مختلف پہلو سامنے آئے۔

سیمنار کے آخری دن اتفاقاً میرے بہت مخلص دوست حکیم سید ظل الرحمن ندوی صدر شعبہ علم الادویہ مل گئے، وہ تجارہ کے سادات کے ایک ممتاز اور ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور خود بھی بہت شائستہ اور اعلا علمی و ادبی ذوق رکھتے ہیں، ان کے ہمراہ پہلے ان کے شعبے پھر دولت کدہ پر گیا، تھوڑی ہی دیر میں وہ مکان کے بالائی حصے پر ابن سینا علمی و طبی اکیڈمی کی ظل الرحمن لائبریری کی شاندار اور دلکش عمارت میں لوا گئے، جو حال ہی میں تعمیر ہوئی ہے، پہلے استقبالیہ کمرے میں داخل ہوا جس میں ایک چھوٹی میز دو کرسیاں اور ایک الماری تھی جس میں تقریباً ڈیڑھ سو فاؤنٹن پن رکھے ہوئے تھے جن کو مختلف ملکوں کی کمپنیوں نے تیار کیا تھا، اس کمرے سے متصل بائیں جانب باتھ روم تھا اور دائیں جانب ایر کنڈیشن کمرہ جس میں چار سو مخطوطات اور قرآن کے نو مطلا و مذہب نسخے تھے، دو کمپیوٹر بھی تھے، پوری لائبریری کو کمپیوٹر پر لانے کی اسکیم ہے، اس کے بعد لائبریری کا وسیع ہال ہے اور ابھی اتنا ہی بڑا ہال اور تعمیر کرنے کا منصوبہ ہے۔

لائبریری میں فن وار بارہ ہزار سے زیادہ کتابیں بڑے سلیقے سے شیشے کی الماریوں میں رکھی ہوئی

ہیں تاریخ طب و سائنس، سر سید تحریک، غالب و اقبال اور طب یونانی پر خاص طور سے کتابیں جمع کی گئی ہیں، اس غالب نمبر تھے جو غالب پر قائم اداروں میں بھی نہیں ہیں، ابن سینا اپنے خاندانی بزرگوں اور اپنے صاحب زادے ڈاکٹر سید ضیاء الرحمن کی تصانیف کے الگ گوشے قائم کئے ہیں، ان کے صاحب زادے میڈیکل کے طالب علم تھے مگر انہیں عربی و فارسی کی تعلیم دلائی تاکہ وہ اس قیمتی ورثے کے جائز اور صحیح وارث بنیں لائبریری میں مختلف ممالک کے ۲۶ ہزار ڈاک ٹکٹ، ڈھائی ہزار سکے، کرنسی نوٹ، وصلیاں، پینٹنگ، نادر فرامین اور ابن سینا کے متعدد اسٹیچو بھی ہیں عمارات اور ارزاں بن سکتی تھی مگر کتابوں کی حفاظت اور دیمک وغیرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے گرانی کی پروا نہیں کی گئی، لائبریری ہال میں ۸۰ افراد کے بیٹھنے کے لئے میز اور کرسیوں کا انتظام ہے جس میں اچھا علمی اجتماع ہو سکتا ہے، میں ان کے خون جگر کا یہ معجزہ دیکھ کر بے اختیار بول اٹھا۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند تو حکیم صاحب یوں گویا ہوئے۔

مسلم یونیورسٹی سے متمول اساتذہ بھی وابستہ رہے اور اصحاب علم و ذوق بھی، بعض نے کتابوں کا ذخیرہ بھی جمع کیا جو ان کی زندگی ہی میں یا ان کے بعد فروخت ہو گیا، علم کے فروغ یا نوجوان نسل کو تصنیف و تالیف میں مدد فراہم کرنے کا کام نہیں ہوا، پہلے یہ طریقہ تھا کہ باہر سے جو نامور حضرات تشریف لاتے ان سے اسٹاف کلب میں لکچر دلایا جاتا مولانا سید سلیمان ندوی کے بھی کئی لکچر ہوئے اب یہ روایت ختم ہو گئی اور کوئی مرکز نہیں جہاں باہر سے آنے والے کے اعزاز میں نشست کی جائے پہلے اساتذہ سبکدوش ہونے کے بعد اپنے اپنے وطن چلے جاتے تھے اب وہ یہیں آباد ہو جاتے ہیں، ان میں ہر علم و فن کے ماہرین ہوتے ہیں، ضرورت ہے کہ ان کے علم و فضل سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کے لکچر کا انتظام کیا جائے، آج کل جو لوگ کتب خانے اور ادارے قائم کرتے یا رفاہی کام کرتے ہیں تو اس کے لئے چندے کرتے اور اپنا ایک حبہ بھی خرچ نہیں کرتے، حکیم صاحب پوری قوم کے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اپنی گاڑھی کمائی سے یہ اکیڈمی اور لائبریری قائم کی تاکہ کتابوں کا یہ قیمتی اثاثہ محفوظ ہو جائے اور اس کا فیض ہمیشہ جاری رہے، ایسے عظیم الشان کارنامے کی مثال اس زمانے میں نہیں مل سکتی۔

مقالات

ساتویں صدی ہجری کی چار

نامور ایرانی خواتین

از پروفیسر نذیر احمد*

تاریخوں کے مطالعے سے ہم کو اسلامی معاشرے کی سینکڑوں نامور خواتین کا حال معلوم ہو جاتا ہے جنھوں نے زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں ناموری حاصل کی تھی، ساتویں صدی ہجری کی ایسی ہی چار نامور خواتین کا تعارف ان سطور میں کیا جا رہا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

زاہدہ خاتون۔ بادشاہ خاتون۔ لش خانم۔ کوردوجین۔

زاہدہ خاتون سلجوقی دور کے شیراز کے آخری اتابک بوزابہ کی بیوی تھی۔ اس کے حالات کے تین مآخذ میرے دسترس ہیں۔

۱۔ شد الازار، تالیف جنید شیرازی ۷۹۱ھ۔

۲۔ ہزار مزار، ترجمہ شد الازار مترجم عیسیٰ پسر جنید شیرازی۔

۳ شیراز نامہ، تالیف احمد زرکوب شیرازی، تالیف قبل ۷۵۰ھ

اتابک بزابہ[1] یا بوزابہ سلجوقی دور کا شیراز کا چھٹا اتابک یا حاکم تھا، وہ سلجوقی سلطان محمود بن

---

[1] اس کے حالات کے لیے دیکھئے شیراز نامہ ص ۶۶، شد الازار ص ۲۵۷، ۲۸۱-۸۲، ۳۴۹، راحۃ الصدور ص ۲۳۱-۲۳۷، ۲۳۱، ۲۴۱، ۲۴۳، زبدۃ النصرۃ وغیرہ، شیراز نامہ ص ۶۰ میں ایک عنوان کے تحت اتابک بزابہ کے قتل کا ذکر ہے۔

---

* سرسید نگر، علی گڑھ۔

بن مسعود بن ملک شاہ کے زمانے میں شیراز کے حاکم نیکو برس کی وفات کے بعد مقرر ہوا تھا، بعض اقوال کے مطابق وہ ۵۳۳ سے ۵۴۳ تک یعنی دس سال تک (شدالازار حاشیہ ص ۲۵۷) اور بعض کے مطابق ۱۵ یا ۱۷ سال تک وہاں کا حاکم رہا (شیراز نامہ ص ۶۶) اس نے وزارت کا عہدہ تاج الدین وزیر کے سپرد کیا، اتابک بزابہ[۱] کے بعد سلطان محمد جب شیراز کا حاکم مقرر ہوا تو اس نے تاج الدین کو اپنا وزیر بنایا جس کی کارکردگی ضرب المثل تھی۔ اتابک بزابہ خود بڑا مدبر اور دوراندیش

---

۱ اتابک بزابہ ۵۴۳ میں مارا گیا (راحۃ الصدور ص ۲۴۳ متون حاشیہ) اس کے قتل کی تفصیل کے لئے دیکھئے راحۃ الصدور ص ۲۴۳ ۲ اس کا پورا نام ابوالفتح تاج الدین بن دارست شیرازی تھا، وہ چند بار سلطان مسعود بن محمد بن ملک شاہ (۵۲۶-۵۴۷) کا وزیر تھا، ۵۲۶ میں سلطان سنجر اور سلطان مسعود کے درمیان جو جنگ ہوئی اس میں تاج الدین قید ہوا، اس وقت وہ سلطان مسعود کا وزیر تھا، (عماد کاتب، تاریخ سلجوقیہ ص ۱۵۹) اس کے بعد امیر بزابہ کی حکومت (۵۳۲-۵۴۳) کے زمانے میں وزیر رہا، ۵۴۰ میں امرائے مسعود کے تین فرد یعنی امیر بزابہ، عبدالرحمن بن طغایرک وعباس والی رے نے ایک گروہ بنایا جس نے امیر مسعود کو مجبور کیا کہ وہ بزابہ کو وزیر کا عہدہ سپرد کردے۔ ۵۴۰ھ میں امیر عباس والی رے قتل ہوا تو عباس کے سپاہیوں نے بغداد میں بڑی شورش کی اور تاج الدین وزیر کا گھر گھیر لیا، لیکن سلطان کی توجہ سے اس کا گھر بربادی سے بچ گیا، کچھ دنوں بعد وہ وزارت سے الگ ہوگیا۔ سلطان اس کو وزارت کے عہدے پر برقرار رکھنا چاہتا تھا لیکن یہ نہ ہوسکا تو شمس الدین ابونجیب درگزینی وزیر مقرر ہوا۔ شدالازار ص ۲۵۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ تاج الدین سلغری اتابک سنقر بن مودود (۵۴۳-۵۴۸) کے زمانے میں بھی وزارت کے عہدے پر مامور تھا۔

عماد کاتب (زبدۃ النصر ص ۲۱۵) نے تصریح کی ہے کہ تاج الدین بن دارست شیرازی ملک شاہ کی زوجہ ترکان خاتون کے وزیر تاج الملک مرزبان بن خسرو فیروز معروف بہ ابن دارست (بقیہ حاشیہ ص ۱۶۷)

حاکم تھا، تاج الدین کی حسن کارکردگی نے اس دور کو بہت اہم بنا دیا تھا، خیرات و مبرات کی اشاعت میں یہ زمانہ شیراز کی تاریخ میں خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ اتابک بزابہ کی اہلیہ زاہدہ خاتون تھی۔ اس کی دانش مندی اور فرزانگی قابل تعریف تھی، شیراز نامہ میں زاہدہ خاتون کے بارے میں یہ اطلاع ملتی ہے:

زاہدہ[۱] خاتون بڑی ہوشیار اور دلیر خاتون تھی، کہتے ہیں کہ وہ تدبر اور ہوش مندی میں مردوں سے بڑھی ہوئی تھی۔

شیراز میں اس نے مدرسہ عالیہ کی بنیاد ڈالی، مدرسہ کی عمارت سے زیادہ شیراز کی کوئی عمارت شاندار نہ تھی، بلکہ ملک فارس کی ساری عمارتوں میں کوئی عمارت اتنی شاندار اور دیدہ زیب نہ تھی، اس پر ایک اونچا منارہ تھا، اس سے عمارت کی شان دوبالا ہورہی تھی، مدرسے سے متعلق کئی موقوفات تھے۔

کہتے ہیں کہ زاہدہ خاتون فارس و شیراز کے نواح کی حاکم تھی، اس کی حکومت[۲] کی مدت اکیس سال کی تھی، سیاسی اقتدار کے ساتھ اس نے کافی دولت و ثروت جمع کرلی تھی، ویسے تو اس کو بڑی دولت ترکے میں ملی تھی، پھر اس کے شوہر اتابک[۳] بزابہ نے اس پر کافی اضافہ کیا،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۶) کا بھانجا تھا، ترکان خاتون نظام الملک طوسی سے بڑی عداوت رکھتی تھی، کہتے ہیں نظام الملک طوسی کے قتل میں وزیر ابن دارست کا ہاتھ تھا۔ یہ وزیر نظام الملک کے بہی خواہوں کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا، (دیکھئے عماد کاتب (۶۱-۶۲) شدالازار ص ۲۵۷-۵۸ حاشیہ (حاشیہ ص ہذا) ۱ دیکھئے شیراز نامہ ص ۶۶-۶۷ ۲ ایضاً ص ۶۷ ۳ ایضاً، اتابک بزابہ یا بوزابہ اس کا شوہر تھا، وہ ۵۴۳ میں اصفہان میں مارا گیا۔ شدالازار حاشیہ ص ۲۸۲ میں اس کی مدت حکومت دس سال کی یعنی ۵۳۲ تا ۵۴۲ بتائی گئی ہے، لیکن شیراز نامہ ص ۶۶ میں ۱۵ یا ۱۷ سال کی، بوزابہ ملک شاہ سے لڑتے اصفہان میں مارا گیا (بقیہ حاشیہ ص ۱۶۸ پر)

زاہدہ خاتون نے یہ ساری دولت مدرسے پر وقف کر دی تھی۔

کہتے ہیں کہ مدرسے کی تولیت پہلے علمائے حنفیہ کے سپرد کی گئی، بعد میں یہ تولیت شافعیوں کے سپرد ہوئی اور امام ناصر الدین[1] سیرانی جو اس دور کے مشاہیر علماء میں تھے اور مسجد عتیق کی امامت وخطابت قدیم الایام سے انہیں کے خاندان کے علماء سے مخصوص تھی، انہیں مدرسہ کا صدر مقرر کر دیا۔ مدرسہ کا انتظام نہایت معقول تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ و مدرسین نہایت آرام وسکون سے رہتے اور علمی خدمت انجام دیتے۔ یہ بڑی[2] بابرکت جگہ تھی، اس کی زیارت بڑی متبرک

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۷) تو اس کی اہلیہ زاہدہ خاتون نے اس کی ہڈیاں چننے کے لئے کچھ لوگ اصفہان روانہ کئے، جب یہ ہڈیاں شیراز پہونچیں تو بڑی آب و تاب سے دفن کی گئیں۔ وہاں ایک بلند قبہ اور وسیع مدرسہ تعمیر ہوا ...... [1] شیراز نامہ ص ۶۰ پر یہی ہے د سیرافی کے بجائے شرا(بی) لیکن شد الازار ص ۲۸۲ کی رو سے یہ مدرسہ قاضی مجد الدین اسماعیل بن قاضی یحییٰ بن قاضی اسماعیل نیک روز فالی سیرافی کی سپردگی میں دے دیا گیا (شد الازار ص ۲۸۲ متن وحاشیہ و ہزار مزار ص ۲۲۵) [2] شد الازار ص ۲۸۲، ہزار مزار ص ۲۲۶۔ ہزار مزار ص ۲۲۴ میں حسب ذیل عبارت بڑھائی گئی ہے:

اس کے ہمسایہ میں خاتون سر دو چین جو فقراء کی دوست اور صاحب خیر تھی اور جو علماء و فضلاء کی تربیت کرتی تھی اور اس کی نیکیوں کے آثار آج تک باقی ہیں، بہت سے لوگ اس کے فیض عام سے اور خاص و عام اس کی بخشش و انعام سے بہرہ مند ہیں اور طلبہ و حفاظ و عباد و زہاد اس کے اقسام خیرات سے بہرہ یاب ہیں، اس کا مدفن اس کی ماں بی بی زبیدہ خاتون کے ہمسایہ میں ہے۔

مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کر دوچین کی ماں کا نام زبیدہ خاتون ہوگا لیکن واقعہ یہ نہیں وہ تو ابش خاتون کی بیٹی تھی؟ اس صورت میں ضمیر "او" کا مرجع غالباً زاہدہ خاتون ہوگا، زبیدہ خاتون سلطان ملک شاہ کی بیوی تھی، اس کے باپ کا نام امیر یاقوتی اور بھائی کا امیر اسماعیل، زبیدہ کا بیٹا برکیارق تھا (بقیہ حاشیہ ص ۱۶۹ پر)

سمجھی جاتی۔ ایک بلند قبہ اور وسیع مدرسہ تیار ہوا اور اس پر بہت بڑی رقم، زمین اور مکانات وقف کئے گئے۔ پھر ایک حنفی عالم کو متولی بنایا گیا، اس کے بعد پھر اس کو شافعی عالم کے سپرد کیا گیا۔ شد الازار کے ایک نسخے کی رو سے قاضی مجد الدین اسماعیل بن قاضی یحییٰ بن قاضی اسماعیل نیکروز کی سپردگی میں وہ مدرسہ اور قبہ دیا گیا (شد الازار ص ۲۸۲ متن وحاشیہ) نیز دیکھئے ترجمہ شد الازار (ص ۲۲۵)

بادشاہ خاتون: کرمان فرمانروا قطب الدین کی بیٹی تھی، قطب الدین کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں، لڑکوں کے نام حجاج اور سیورغتمش اور لڑکیوں کے ترکان اور بادشاہ خاتون تھے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ قطب الدین کی بیوی جس کو وہ بعد میں اپنے حبالہ نکاح میں لایا اس کا بھی نام ترکان خاتون تھا اور وہ قطب الدین کی وفات کے بعد ۶۵۶ھ میں کرمان کی فرمانروا ہوئی تھی۔

بادشاہ خاتون کا باپ قطب الدین براق حاجب کا بھتیجا تھا، براق حاجب سلطان جلال الدین کے امراء میں تھا، اس نے سلطان غیاث الدین کو قتل کر کے خلیفۂ بغداد الناصر الدین[1] کی طرف سے سلطان کا لقب حاصل کر لیا اور قتلغ سلطان کے لقب سے ملقب ہوا، سلطان غیاث الدین کی محبوبہ ترکان تھی، وہ قاضی القضاۃ رکن الصاعد کے یہاں بطور مہمان قیام پذیر

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۸) جو ملک شاہ کا سب سے بڑا بیٹا تھا، ملک شاہ کی ایک دوسری بیوی ترکان خاتون تھی جس کا ایک چھوٹا بیٹا تھا، ترکان کے اپنے بیٹے کو ولی عہد بنانے کے لئے ملک شاہ کے آخری عہد کی پوری سیاست گھومتی تھی، بالآخر نظام الملک جو برکیارق کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا قتل ہوا اور ملک شاہ بھی چند ہی دنوں میں وفات پا گیا (دیکھئے راحۃ الصدور ص ۱۳۴ ببعد)۔۔۔۔۔ [1] تحریر تاریخ وصاف ص ۸۷ نیز بزرگان شیراز ص ۳۸۱ میں آتابک منکو برس جس نے مزار ام کلثوم کے جوار میں مدرسہ بنایا تھا اور اس کا بھی مزار وہیں ہے، اس کی بیوی کا نام زاہدہ خاتون لکھ دیا ہے جو غلط ہے۔

تھی۔ غیاث الدین کے قتل کے بعد اتابک یزد علاء الدین محمود نے ترکان کو جبراً قاضی القضاۃ کے یہاں سے منگوا لیا اور اس کو اپنے نکاح میں لینا چاہا تو براق حاجب نے اپنا دعویٰ پیش کیا، آخر میں اس بات پر صلح ہوئی کہ براق حاجب کے سپرد کی جائے اور معز الدین اپنی ایک بیٹی علاء الدولہ محمود اتابک یزد کو دے، براق حاجب ترکان کو لے کر کرمان چلا آیا، اسی درمیان اس نے اپنے بیٹے رکن الدین کو تحفے تحایف کے ساتھ قاآن کے پاس بھیجا، انہیں دنوں براق حاجب کا انتقال ہوگیا، قاآن نے رکن الدین کو براق حاجب کے لقب یعنی قتلغ سلطان کے لقب سے کرمان کا حاکم مقرر کر دیا اور رکن الدین کے چچازاد بھائی قطب الدین کو اپنے دربار میں بلایا۔ اس درمیان رکن الدین مطمئن ہوکر کرمان میں تخت نشین ہوا۔

قطب الدین اپنی زوجہ ترکان خاتون اور دو بیٹوں کو ساتھ لے کر قاآن کے دربار میں حاضری کے لئے روانہ ہوا، جب وہ قاآن کے دربار میں پہنچا تو قاآن نے اس کو محمود یلواج کے پاس ختا بھیجا، اس درمیان منکو قاآن خانیت کے تخت پر بیٹھا تو قطب الدین محمود یلواج کے ساتھ قاآن کی خدمت میں پہنچا تو قاآن نے ان کو نوازا اور کرمان کی حکومت قطب الدین کے سپرد کی۔ رکن الدین بے دخل ہوا اور ۶۵۱ھ میں قاآن کے دربار میں پہنچا، کچھ ہی دنوں میں قطب الدین بھی قاآن کے دربار آسمالیغ میں حاضر ہوا، دونوں سے قاآن نے واقعات دریافت کئے۔ اس کے نتیجے میں قطب الدین مورد الطاف قرار پایا اور رکن الدین کو اس کے سپرد کر دیا، چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد قطب الدین نے رکن الدین کو قتل کر دیا، اس کے بعد روز بروز اس کی ترقی ہوتی گئی لیکن قسمت نے زیادہ ساتھ نہیں دیا، شکارگاہ میں ایک مینڈھے نے ایسی سینگ ماری کہ اس کے زخم سے ۶۵۶ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ترکان خاتون کرمان کے تخت پر بیٹھی اور نہایت مستعدی اور قابلیت سے حکومت کرنے لگی۔ قاآن کے دربار میں ہدیے

اور تحفے بھیجتی رہی اور اس وجہ سے مورد توجہ و عنایت رہی۔

ترکان نے پہلے اپنے سوتیلے بیٹے حجاج کو امور سلطنت سپرد کیا مگر وہ ٹھیک طور پر کام نہ کر سکا اور بھاگ کر ہندوستان چلا گیا، پھر اس کے بعد دوسرے سوتیلے بیٹے سیورغتمش کو حکومت کا کام سپرد کیا گیا تو اس نے نہایت قابلیت سے حکومت کا کام سرانجام دیا، سیورغتمش ربیع الاول ۶۸۱ میں تخت نشین ہوا تھا۔

قطب الدین کے دو بیٹے حجاج اور سیورغتمش تھے، حجاج تو بھاگ کر ہندوستان چلا آیا تھا اور سیورغتمش حکومت کا کام قابلیت سے چلا رہا تھا۔

سیورغتمش نے فرمان شاہی کے بموجب ابش خاتون دختر اتابک سعد بن ابوبکر بن سعد زنگی کی مشہور بیٹی کوردوجین کو اپنے حبالہ نکاح میں لے لیا اور خود اپنی بیٹی شاہ عالم کو شاہزادہ سے وابستہ کر دیا تھا اور اس سے قبل جب اباقاخاں تخت نشین ہوا تو وہ بادشاہ خاتون سے نسبت کا طالب ہوا، ترکان نے بادشاہ خاتون کو ہر طرح سے آراستہ کر کے روانہ درگاہ کر دیا، عقد ازدواج کے بعد اباقاخان کو بادشاہ خاتون سے ایسا خاص تعلق پیدا ہوا کہ اس کو دوسری تمام خواتین سے ممتاز کر دیا، یہ مواصلت سلطنت کرمان کی بقا کا موجب ہوئی، چنانچہ ترکان خاتون کی حکومت کی مدت تیس سال سے زاید رہی۔

جب کیخاتو خان مقرر ہوا تو بادشاہ خاتون کا مرتبہ اور زیادہ ہوا اور وہ تمام خواتین میں سب سے زیادہ صاحب مرتبہ قرار پائی، بادشاہ خاتون عرصے سے کرمان نہ آئی تھی، فرمان ہوا کہ وہ کرمان لائی جائے، وہ کرمان آئی تو ملوک و حکام اور امرا اس کے استقبال کے لئے آئے، شہر کی آرایش کی گئی، بادشاہ خاتون بڑی شان سے محل میں اتری اور تخت پر بیٹھی، اسی وقت اس کے حکم سے سیورغتمش جو اس کا سگا بھائی اور کرمان کا حکمراں تھا، پکڑ کے قلعہ بھیج دیا گیا،

اور بادشاہ خاتون خود حکومت کے کام کو سنبھالنے لگی۔ اس نے خطبہ و سکہ اپنے نام سے جاری کیا، وہ نہایت کامیاب حکمراں ثابت ہوئی، نہایت مخیر حاکم تھی، علماء و فضلاء و شعراء کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتی، دربار علماء و فضلاء و شعراء سے بھرا رہتا تھا، خود طبع لطیف کی مالک تھی، اس کا خط بہت اچھا تھا، فن لغت و عروض میں کافی مہارت رکھتی تھی، مشاعرہ و ارباب فضل سے مکالمہ میں خاصی دلچسپی رکھتی تھی، خود شاعرہ بھی اور حسن شاہ تخلص کرتی تھی، اس کے اشعار ادھر ادھر بیاضوں میں نقل ہوئے ہیں۔ حسب ذیل اشعار تحریر تاریخ وصاف ص ۱۷۸، ۱۷۹ میں درج ہیں:

من آن زنم کہ ہمہ کار من نکوکاری است
بہ زیر مقنعہ من (ہم) بسی کلہ داری است
درون پردہ عصمت کہ تکیہ گاہ منست
مسافران صبا راہ گذر بہ دشواری است
نہ ہر زنی بہ دو گز مقنعہ است کد بانو
نہ ہر کسی بہ جہان درخور جہانداری است
کلاہ مرد بلند از وجود مقنعہ ای است
کہ از سر کلۂ دیگرانش بیزاری است
بہ ہر کہ مقنعہ بخشم سزد کہ او گوید؟
چہ جای مقنعہ تاج ہزار دیناری است
طناب چنبر زن گشتہ باد مقنعہ را
کہ تاز آن نہ زمستوی دنکوکاری است

حسن شہم زنشراد شہان الغ ترکان
زنا برند اگر در جہان جہانداری است

سیورغتمش جو مکہ میں نظر بند اپنی بہن بادشاہ خاتون کی دشمنی سے پریشان اور خوفزدہ تھا، اس نے قلعہ میں پانی پلانے والے سے سقہ سے سازباز کی، نتیجہ اس کی زنجیر کٹ گئی، وہ نکل بھاگا اور ایلخان کے دربار میں پہنچ گیا، بادشاہ خاتون نے قاصد بھیجا اور کہلایا کہ اس کو پکڑ کر میرے پاس واپس بھیجا جائے، کیخاتو نے باوجود اس کے کہ سیورغتمش اس کے یہاں پناہ گزیں تھا، واپس بھیجنے کا حکم جاری کر دیا، بادشاہ خاتون نے اس کی خطا معاف کر دینے اور اس کو دوبارہ بادشاہی لوٹا دینے کا وعدہ کیا تھا، لیکن رات میں چند خاص آدمیوں کو بھیج کر سیورغتمش کا کام تمام کر دیا، یہ واقعہ رمضان ۶۹۳ھ کا ہے۔ نہ بھولنا چاہئے کہ سیورغتمش بادشاہ خاتون کا بھائی تھا، وہ قطب الدین کی بیٹی اور سیورغتمش اس کا بیٹا تھا۔ حکومت کی خواہش میں بھائی کا خون رمضان میں جائز سمجھا گیا۔

جب سیورغتمش کو قتل کیا گیا تو اس کی بیوی شہزادی کوردوچین نے مراسم عزا برپا کیا اور پوشیدہ طور پر ساری معزز خواتین اور با اثر امیروں کو اس المناک واقعہ سے باخبر کیا، اسی درمیان کیخاتو خاں[1] کے قتل کا واقعہ ہو چکا تھا، ہر طرف انتقام اور استبداد کی فضا دکھائی دیتی تھی، تاریخ وصاف میں اس سلسلے میں محمد ایداجی کی حکایت نقل کی ہے۔

محمد ایداجی کیخاتو خاں کے ابتدائے جلوس سے اصفہان کی حکومت پر مامور تھا لیکن خاموشی سے غازان خان سے اپنا اخلاص ظاہر کرتا تھا، کیخاتو کو یہ حقیقت معلوم تھی مگر وہ اس سے چشم پوشی کرتا تھا، لیکن اس کی حکومت کے آخری زمانے میں حکم ہوا کہ خماری اس کو گرفتار کر کے دربار میں

[1] کیخاتو کا قتل جمادی الاول ۶۹۳ھ میں ہوا اور مدت حکومت ۴ سال تھی (تحریر، ص ۱۷۰)

لے آئے لیکن جب خماری کاشان پہنچا تو کیخاتو کا قتل ہو چکا تھا اور امرا کے درمیان سخت اختلاف رونما ہو چکا تھا، محمد ایداجی کے دوست موقع سے فائدہ اٹھا کر جس زنجیر سے محمد کو جکڑا تھا، اسی سے خماری کو جکڑ کر اصفہان بھیجا گیا اور وہاں وہ قتل کر دیا گیا۔ (تحریر ص ۱۷۹-۱۸۰)

اب بایدو کو خانیت ملی، سیورغتمش کی بیٹی شاہ عالم احمد کی بیوی تھی، شہزادی کوردوجین بھی اپنے شوہر سیورغتمش کے قاتل سے قصاص کی طالب ہوئی، غرض ایلخان نے بادشاہ خاتون سے قصاص لینے کا فیصلہ کیا اور حکم دیا کہ شیراز اور شبانکارہ سے فوج جمع کی جائے اور بادشاہ خاتون جو بغاوت پر تلی ہوئی تھی اس کو پکڑ کر دربار میں حاضر کیا جائے، بادشاہ خاتون کو صورت حال کی اطلاع ہوئی تو اس نے فوج جمع کی اور قلعہ کا دروازہ بند کرا کے قلعہ بند ہو گئی، ادھر اس کے دو سردار پکڑ لئے گئے، اس سے بادشاہ خاتون کو یقین ہو گیا کہ ایلخان کے فرمان کے ماننے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں، اس کی طرف فرمان جاری ہوا کہ کوردوجین کرمان کی حکمراں ہو، بادشاہ خاتون پکڑ لی گئی اور سیورغتمش کے مکان میں قید کر دی گئی، پھر شعبان ۶۹۴ھ میں اسے قتل کر دیا گیا، لیکن اس کا کفن دفن ایک دیہاتی نے کچھ رقم قرض لے کر کیا، بادشاہ خاتون نے اپنے بھائی سیورغتمش کو ایک سال پہلے قتل کرایا تھا، ایک سال بعد خود بادشاہ خاتون اپنی بھتیجی شاہ عالم کے زیر اثر اور اپنے مرحوم بھائی کی بیوی کوردوجین کے ہاتھوں قتل کر دی گئی۔ (تحریر تاریخ وصاف ص ۱۸۰-۱۸۱)

ابش خاتون[1]: اتابک سعد بن ابی بکر بن سعد بن زنگی کی بیٹی تھی، اتابک سعد اپنے باپ

[1] یہ سلغری خاندان کی آخری فرمانروا تھی سلغری فرمانرداؤں کی یہ فہرست ہے۔

- اتابک سنقر بن مودود ۵۴۳
- اتابک زنگی بن مودود ۵۵۶
- اتابک تکلہ بن زنگی
- اتابک سعد بن زنگی ۵۹۱
- اتابک ابوبکر بن سعد ۶۲۳
- اتابک سعد بن ابوبکر ۶۵۸
- اتابک محمد بن سعد بن ابوبکر ۶۵۸
- اتابک محمد شاہ بن سلغر شاہ بن سعد بن زنگی ۶۶۱
- اتابک سلجوق شاہ بن سلغر شاہ ۶۶۲
- اتابک ابش خاتون بنت سعد بن ابوبکر بن سعد بن زنگی ۶۶۲-۶۸۲

ابوبکر بن سعد کی وفات (۶۵۸ھ) کے بعد ۱۷-۱۸ روز سے زیادہ زندہ نہیں رہا، وہ اپنے باپ کے حکم سے ہلاکو کے دربار میں گیا تھا واپسی میں ابھی وہ راستہ میں تھا کہ اس کے باپ کی وفات ہو گئی، اور خطبہ وسکہ اس کے نام سے جاری ہو گیا، لیکن ابھی شیراز نہیں پہنچا تھا کہ یکایک اس کو بیماری لاحق ہو گئی اور ۱۷ روز بعد اس کا انتقال ہو گیا، اس کا تابوت شیراز لایا گیا اور مدرسہ عضدیہ کے دروازہ پر جو اس کی بیوی ترکان خاتون کی ملکیت تھی اس کو دفن کیا گیا۔ اتابک سعد کا ایک بیٹا اتابک محمد تھا جو اپنے باپ کی جگہ اتابک مقرر ہوا، لیکن اس کی نیابت میں اس کی ماں ترکان خاتون حکومت کرتی تھی، دو سال ۷ ماہ بعد اتابک محمد کوٹھے پر سے گر پڑا اور ۶۶۱ھ میں فوت ہوا، ترکان خاتون گریہ وزاری کرتی اور یہ شعر پڑھتی تھی:

ایں چہ باد است کز و غنچہ نشکفتہ بریخت

ویں چہ سیل است بہ کند ز بن شمشادم (شیراز نامہ ص ۸۷)

اتابک محمد کے بعد اتابک ابوبکر کا بھائی محمد شاہ بن سلغر شاہ اتابک مقرر ہوا، اس سے ابش کی بہن سلغم منسوب تھی، لیکن ابھی اسے ایک سال بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ ترکان خاتون کی کوشش سے وہ مقید ہو کر ایلخان کے دربار میں رمضان ۶۶۱ھ میں بھیج دیا گیا۔

اس کے بعد اس کا بھائی سلجوق شاہ ترکان خاتون کی وساطت سے اتابک مقرر ہوا، اس نے ترکان سے عقد کر لیا تھا پھر اسے قتل کرا دیا لیکن چند ماہ بعد (۶۶۲ھ) وہ بھی مارا گیا، اس کی سلطنت بھی ۵ ماہ سے زیادہ نہ چلی (شیراز نامہ ص ۸۹)

سلجوق شاہ کے بعد ابش خاتون ۶۶۲ھ میں اتابک مقرر ہوئی۔

تاریخ وصاف میں ابش خاتون کے بارے میں جو اطلاعات درج ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

ابش خاتون ۶۶۲ھ کے اوائل میں تخت نشین ہوئی اور اس کی والدہ ترکان خاتون (مقتول

۶۶۲ھ) نے اس کا نکاح ہلاکو خاں کے بیٹے منکو تیمور سے کر دیا تھا، احمد تکودار کے اوائل سلطنت گویا جلوس سلطنت کے ایک سال بعد (یعنی ۶۷۲ھ) اتابک ابش کو جس کو تخت نشین ہوئے دس برس ہوچکے تھے (۶۶۲ تا ۶۷۲) اور جو وہ مغل دربار میں اپنے شوہر منکو تیمور پسر ہلاکو (مقتول در ۶۸۰ در جنگ با مصریان و شامیان) کے ساتھ رہ رہی تھی، وہ شیراز کی حکومت پر نامزد ہوئی، اس خبر سے اہل شیراز بہت خوش ہوئے اور انہوں نے شہر بھر میں چراغاں کیا اور بڑی خوشی منائی۔

ابش خاتون ۶۸۲ کے قریب شیراز پہنچ کر حکومت کے کام میں مشغول ہوئی، اسی درمیان یعنی ۶۸۳ میں ارغون خان نے سید عماد الدین ابو یعلی کو حکومت فارس پر منصوب کر دیا (ص ۲۱۲) اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہوا کہ ابش خاتون فوراً مغل دربار حاضر ہوجائے۔ سید مذکور شیراز میں ۲۲ رمضان ۶۸۳ میں وارد ہوئے تھے، ان کا دبدبہ اتنا بڑھا کہ وہ نہ تو ابش کی پروا کرتے اور نہ شہر کے عمائد کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں بعد وہ قتل کر دئے گئے اور ان کا مکان لوٹ لیا گیا، یہ واقعہ ۱۲ شوال ۶۸۳ کو وقوع پذیر ہوا، ان کے قتل کے ساتھ ہی ان کے بھتیجے سید جمال الدین محمد بھی قتل ہوئے۔ اس واقعے کی اطلاع عماد الدین کے نابالغ بیٹے اور دوسرے چند بھاگے ہوئے اشخاص کے ذریعہ بوقا کو جو ارغون کا بڑا معتمد علیہ تھا ہوئی، وہ نہایت غضبناک ہوا اور ابش خاتون کی طلبی کے لئے ایلچی پر ایلچی بھیجے، چنانچہ ۶۸۴ میں ابش خاتون اپنے اعوان و انصار کے ساتھ اردو پہنچی، اگرچہ اس کے ساتھ سختی کا سلوک نہیں ہوا لیکن اس کے دوسرے ساتھیوں کو سخت سزائیں دی گئیں اور حکم ہوا کہ ۵۰ تومان سید عماد الدین کے اولاد کو اور بیس تومان سید جمال الدین کے یتیم بچوں کو دئے جائیں۔

اتابک ابش خاتون کو منگول دربار میں ایک سال چند ماہ گزرے تھے کہ وہ بیمار ہوگئی اور

ایک دو ہفتہ میں فوت ہوگئی، دراصل حکومت سے برطرفی اور منگول دربار میں اس کی حاضری اس کے لئے بڑی شاق گزری اور وہ اس ذلت کو آسانی سے برداشت نہ کر سکی، اس کی بیماری اور وفات اس کا نتیجہ تھیں۔

اگرچہ ابش خاتون دین دار مسلمان تھی لیکن اس کو قبر میں منگول رسوم کے مطابق دفن کیا گیا، سونے چاندی کے برتن شراب سے پُر کرکے اس کے ساتھ قبر میں رکھے گئے، البتہ کچھ دنوں بعد اس کی بیٹی شہزادہ کوردوجین لاش نکلوا کر شیراز لائی اور مدرسہ عضدیہ میں جو اس کی نانی یعنی ابش خاتون کی ماں ترکان خاتون نے اپنے جواں مرگ بیٹے عضد الدین محمد بن سعد کے نام پر بنوایا تھا، دفن کرایا۔

اتابک ابش خاتون کی اتابکی کی مدت بائیس سال کی تھی (یعنی ۶۶۲ سے ۶۸۴ تک) سعدی شیرازی نے ابش کا زمانہ پایا تھا چنانچہ انہوں نے ایک مدحیہ قطعہ اس کے لئے نظم کیا تھا جو اوپر نقل ہوچکا ہے۔

ابش خاتون کی وفات سے شیراز میں صف ماتم بچھ گئی، وصاف حضرت نے بھی اس کا مرثیہ لکھا تھا جس کا ایک شعر اس طرح ہے:

تخت را گر بخت بودی کی شدی شہ زو جدا

تاج را گر دیدہ بودی بر ابش بگریستی (تحریر وصاف ص ۱۴۰)

ابش کی شادی کا معاملہ کافی الجھا ہے، تاریخ وصاف (ص ۱۹۰-۱۹۷) سے ظاہر ہے کہ ابش خاتون جلوس سے دس سال بعد تک (۶۶۲ تا ۶۷۲) اپنی سسرال نہیں گئی تھی، سوغونجاق نوئین ۶۷۰ میں شیراز آیا (ص ۲۱۳) اور دو سال کے بعد محاسبات اور خزانے کر اتابک ابش کے ساتھ روانہ درگاہ ہوا: ہمراہ اتابک ابش دختر سعد بحضرت شناخت چہ در زمان مادرش ترکان میان او و منکو تیمور فرزند ہلاکو خاں عقد ازدواج واقع شدہ بود۔ اس سے واضح ہے کہ

ابش کے اپنے شوہر کے یہاں جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ (تحریر وصاف ص ۱۱۵)

مگر اس کے تسلیم کرنے میں بڑی دشواری یہ ہے کہ ۶۷۲ کے بعد اس کی جو اولاد ہوگی اس کی شادی ۶۸۳ھ میں نہ ہو سکے گی اور معلوم ہے ابش خاتون کی بیٹی کردوجین کی شادی جلال الدین سیورغتمش شاہ کرمان کے ساتھ (بحکم یرلیغ ارغون) ۶۸۳ھ میں ہوئی (یادداشتہای قزوینی ج ۱ ص ۲۱۶) یہ اس لئے ناممکن ہے کہ کردوجین کی پیدائش ۶۷۲ھ کے بعد ہوئی ہوگی اور شادی کے وقت اس کی عمر ۱۱ سال سے کم کی ہوگی، پس تاریخ وصاف کی روایت مشکوک ہے، واقعہ یہ ہے کہ ابش کی شادی ۶۶۳ کے قریب ہوئی ہوگی، اسی سال وہ تخت نشین بھی ہوئی ہے۔ انہیں دنوں وہ اپنے شوہر کے پاس گئی ہے، تاریخ گزیدہ ص ۵۰۹ میں ہے: آتابک ابش خاتون را بعد از عم زادہ پدر یعنی سلجوق شاہ بجای مادرش ترکان خاتون (ذکر گذشتہ شدہ بود) پادشاہی فارس دادند، یکسال در فارس حکم کرد، بعد از ان اورا جہت شاہزادہ منکوتیمور بن ہلاکو بخواستند و باردو آوردند (یادداشتہای قزوینی ج ۱ ص ۱۵)، خلاصہ یہ کہ ابش کی منکوتیمور سے شادی ۶۶۳ھ میں (یا شاید کچھ بعد) یعنی جلوس ابش کے ایک سال بعد فرض کریں تو کوئی دشواری نہ ہوگی، اس لئے اس صورت میں ۶۶۳ میں کردوجین کی عمر ۱۹ بیس برس کی ہوگی اور یہ عمر شادی کے لئے مناسب ہے۔ اس سے زیادہ ابش خاتون کے بارے میں اور کچھ معلومات نہیں، البتہ قابلِ ذکر بات ہے کہ سعدی شیرازی نے ابش کی مدح میں حسب ذیل قطعہ لکھا ہے:

فلک را این ہمہ تمکین نباشد | فروغ مہر و مہ چندین نباشد
صبا گر بگذرد بر خاک پایت | عجب گر دامنش مشکین نباشد
زمرواریدِ تاج خسروانیست | یکی در خوشۂ پروین نباشد
بقاء ملک باد این خاندان را | کہ تا باشد خلل در دین نباشد

ہر آنکو سر بگرداند ز حکمت | ازان بیچارہ تر مسکین نباشد
عدو را کز تو بر دل پای پیل است | بزن تا بید قش فرزین نباشد
چنین خسرو کجا باشد در آفاق | وگر باشد چنین شیرین نباشد
خدایا دشمنش جالی بمیراد | کہ ہیچش دوست در بالین نباشد

(کلیات سعدی ص ۷۱۳)

شاہ دخت کردوجین: شاہزادی کردوجین یا کوردوجین آتابک ابش خاتون اور منکو تیمور بن ہلاکو کی نامور بیٹی تھی، نہایت فیاض اور سخی خاتون تھی، اس کی پیدائش کے سلسلے میں کئی روایتیں ہیں، تاریخ وصاف کے مطابق اس کی ماں ابش خاتون اپنی سسرال میں ۶۷۲ ہجری میں گئی، مگر یہ بات اس لحاظ سے قابلِ قبول نہیں کہ اس کی بیٹی کوردوجین کی شادی ۶۸۳ میں سیورغتمش سے ہوئی تھی، اس تاریخ میں کوئی اختلاف نہیں تو جس لڑکی کی پیدائش ۶۷۲ میں ہوئی وہ ۶۸۳ میں شادی کے قابل نہ ہوئی ہوگی، اس وجہ سے ہم بعض تاریخوں کے اس بیان کو صحیح مانتے ہیں جن کے مطابق ابش خاتون ۶۶۳ھ میں یعنی صرف ایک سال کی حکمرانی کے بعد اپنے خاوند منکوتیمور کے یہاں گئی، خلاصہ یہ کہ کوردوجین کی پیدائش ۶۶۳ھ کے کچھ دن بعد ہوئی ہوگی۔ اس کا شوہر جلال الدین سیورغتمش کرمان کا بادشاہ تھا، شاہی حکم نامے کے مطابق کوردوجین کی شادی اس بادشاہ سے ہوئی، لیکن کرمان کے شاہی خاندان میں اختلاف کی لہر دوڑی تو سیورغتمش اور اس کی بہن پادشاہ خاتون میں جو اباقا خاں سے منسوب تھی اتنا اختلاف ہوا کہ پادشاہ خاتون بھائی کو ہٹا کر خود تخت نشین ہوگئی اور رمضان ۶۹۳ھ میں اسے قتل کرا دیا (تحریر تاریخ وصاف ص ۱۷۸ - ۱۷۹)

پادشاہ خاتون تخت نشین تو ہوگئی لیکن اسے چین نصیب نہ ہوا، سیورغتمش کی بیٹی شاہ عالم بایدو

سے منسوب تھی، جب بایدو خاں منتخب ہوگیا تو اس کا اقتدار بڑھا، اس صورت میں شاہ عالم کا اپنے باپ کے اور شہزادہ کوردوجین کا اپنے شوہر کے قصاص پر اصرار بڑھا اس کے نتیجے میں بادشاہ خاتون پر بڑا دباؤ بڑھا، ایلخانی دربار سے حکم جاری ہوا کہ شیراز اور اطراف سے افواج جمع کی جائیں اور بادشاہ خاتون کو تخت سے ہٹا کر ضروری سزا دی جائے۔ شاہزادہ کوردوجین کو بادشاہ بنایا گیا اور بادشاہ خاتون کو ۶۹۴ میں ہلاک کر دیا گیا۔ (تحریر وصاف ص ۱۸۰-۱۸۱)

شیراز نامہ ص ۱۰۳ سے معلوم ہوا کہ ۷۰۱ھ میں ممالک فارس کے جملہ امور شاہزادی کوردوجین کے سپرد تھے، امیر طغائے جو کوردوجین کا شوہر تھا، ۷۰۲ھ میں وہ بھی شیراز آیا اور کوردوجین کے ساتھ امور ملک کے نظم و نسق میں شریک ہوا (شیراز نامہ ص ۱۰۲) امیر طغائے بڑا عادل و رعیت پرور حاکم تھا، اس نے شیراز میں چند عمدہ عمارات بنوائیں اور دروازہ بیضا کے باہر ایک بڑا باغ لگوایا جو باغ طغای کے نام سے مشہور ہوا، پھر وہ اردو بلا لیا گیا اور اسی دوران اس کا انتقال ہوگیا، اس کو تبریز سے شیراز لایا گیا اور کوردوجین کے مدرسے میں دفن کیا گیا (شیراز نامہ ص۱۰۳)

شاہزادہ کوردوجین کا سیاسی اقتدار روز افزوں تھا، یہاں تک کہ ۷۱۷ میں سلطان ابوسعید کے تخت نشین کرانے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔

سلطان الجایتو کی وفات کے وقت شاہزادہ ابوسعید خراسان میں تھا، لشکر منتشر اور سارے امور آشفتہ تھے، کوردوجین حالات سدھارنے کی طرف متوجہ ہوئی، پہلے عورتوں کی دلداری کی پھر شاہزادہ ابوسعید کو بلانے کے لئے تیز رفتار قاصد بھیجے اور وہ آیا تو اس کو تخت نشین کرایا گیا اور اطراف کے حاکموں کو فرمان بھیجے گئے، ۷۱۹ھ میں پورے فارس کی حکومت آل سلغور کے تصرف میں دی گئی اور اس مقصد کے لئے شہزادہ کوردوجین کے نام فرمان صادر ہوا جس کی رو سے پورے خطے پر اس کا حکم مستحکم کر دیا گیا۔ شہزادی لوگوں کے احوال کی نگرانی اور شہروں کو آباد کرنے کی طرف

پوری طرح متوجہ ہوئی اور شیراز میں اپنے خاندان کے بناہائے خیر میں اضافہ کرکے بڑی یادگاریں چھوڑیں، ان کے اجداد بنائے خیریہ تھے: رباط سنقری، رباط ابش، مسجد جامع نو، رباط شہراللہ، دارالشفاء مظفری، رباط خائز، رباط سربند، سقایہ جامع عتیق، خان دودر، رباط عرقی، مدرسہ عضدیہ اور دوسرے موقوفات جن کا حاصل دو سو ہزار دینار سے زیادہ تھا، شاہزادہ کوردوجین نے موقوفات پر اضافہ کیا اور ان کی ساری آمدنی خیرات و صدقات میں صرف ہوں (تحریر وصاف ص ۲۵۹)

شہزادی موصوفہ نے دولت خانہ اتابکی کے جوار میں نئے سرے سے ایک مدرسہ بنایا، جس کی بنیاد نہایت آراستہ ہے، اس میں اوقات نماز رات و دن کے اوقات، سیارات ہفتگانہ نہایت اچھے انداز میں ترتیب دئے گئے تھے اور بندہ وصاف نے جو خاندان سلغری کا پروردہ ہے چند ابیات لکھے ہیں جو آب زر اور تکمیل لاجورد اس کے گرد نقش کر دئے گئے ہیں"۔ اس کے حوالی میں ایک سرابستان بنایا گیا ہے اور اس کے دونوں جانب سقایہ تیار ہوا جس میں صاف و شفاف پانی ہر وقت بہتا رہتا ہے، وہیں ایک نہایت خوبصورت حمام بنایا گیا ہے۔ ان امور کی آمدنی طلبہ، حافظان قرآن، صوفیوں اور دوسرے ضرورت مندوں پر صرف ہوتی ہے۔ اس شہزادی نے اپنی ابدی خوابگاہ کے لئے مدینہ منورہ کے حرم میں باب الرحمہ کے قریب ایک مقام منتخب کر لیا ہے، اس کی عمارت کے لئے حلال رقم صرف ہوئی ہے، خدائے تعالیٰ اس کی دنیا اور آخرت کی آرزوئیں پوری کرے۔ (تحریر وصاف ص ۳۶۰)

شاہزادی کردوجین کی وفات ۷۳۸ میں سلطانیہ میں ہوئی، اس کی لاش شیراز لائی گئی اور مدرسہ شاہی میں ابش خاتون کے جوار میں دفن ہوئی (بزرگان شیراز ص ۳۹۲)

ہزار مزار میں عیسیٰ بن جنید نے کردوجین کی قبر کے بارے میں یہ اطلاع دی ہے (ص ۳۲۶)

بی بی فزاہدہ خاتون کے مزار کے پاس شاہزادی کردوچین کا مزار ہے، موصوفہ فقرا اور درویشوں کی بڑی مدد کرتی، بڑی صاحب خیر اور علما و فضلا کی بڑی مربیہ تھی۔ اس کے آثار خیر عرصے تک باقی رہیں گے، بہت سے لوگ اس کے انعام و اکرام سے مستفیض ہوئے ان میں طلبہ، حفاظ، زہاد وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

کردوچین کی پہلی شادی ۶۸۳ھ کے حدود میں ارغون خان کے جلوس کے اوائل میں جلال الدین سیورغتمش بن سلطان قطب الدین (از ملوک قراختائیان کرمان) سے ہوئی تھی، سیورغتمش بادشاہ خاتون جو اس کی سوتیلی بہن تھی، اس کے ہاتھوں ۶۹۳ میں قتل ہوا، اس کے بعد اس کی شادی امیر ساتالمیش پسر بورانتقی سے ہوئی، اس کے بعد بروایت شیراز نامہ ص ۱۰۳ اس کا عقد نکاح نوئین اعظم امیر طغای سے ہوا جو بروایت علامہ قزوینی (یادداشتہادی قزوینی ج ۱ ص ۱۴) اس کا چچازاد بھائی تھا، ۷۰۱ھ تک ممالک فارس کے تمام امور کردوچین کے سپرد تھے، ۷۰۲ھ میں امیر طغای فارس کے امور کی دیکھ بھال کے لئے شیراز آیا اور اس نے شیراز میں چند عمدہ عمارتیں اور باغات بنوائے پھر اردو واپس بلالیا گیا اور وہیں چند دنوں بعد اس کا انتقال[1] ہوگیا۔

بزرگان شیراز ص ۳۹۳ اور تاریخ مفصل از عباس اقبال ص ۱۰۱ہ میں ہے کہ کردوچین کا نکاح امیر چوپان سے ہوا لیکن علامہ قزوینی[2] اس کو غلط بتاتے ہیں۔

---

[1] اس کی لاش اردو (تبریز) سے شیراز لائی گئی اور کردوچین کے بنائے ہوئے مدرسے میں دفن کی گئی، اس کے آثار خیر میں دروازہ بیضا کے باہر ایک بڑا شاندار باغ تھا جو باغ طغائی کے نام سے مشہور تھا، امیر طغای کی وفات کے بعد امیر ستی کا بیٹا حاجی طغی وہاں کا حاکم مقرر ہوا، اس کی وفات پر کردوچین کی بھانجی سلطان خاتون اپنے شوہر قرہ محمد کے ساتھ شیراز کی متصدی مقرر ہوئی (شیراز نامہ ص ۱۰۳)، [2] علامہ قزوینی نے اس اشتباہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ ادسجا بتو کی بیٹی یا ساتی بیگ کی شادی امیر چوپان سے (بقیہ حاشیہ ص ۱۸۳ پر)

بزرگان شیراز ص ۳۹۴ میں ہے کہ خان مغول نے حکم دیا تھا کہ شاہزادی کردوچین کا نکاح غیاث الدین بادشاہ ہرات سے ہو لیکن یہ نکاح نہ ہو سکا، اس واقعہ کی توثیق کسی اور ذرائع سے نہیں ہو سکی، علامہ قزوینی نے صرف تین شادیوں کا ذکر کیا ہے پہلی سلطان جلال الدین سیورغتمش سے دوسری بورانتقی کے بیٹے امیر ساتالمش سے اور تیسری نوئین اعظم امیر طغای سے، انہوں نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی کوئی اولاد تھی یا نہیں۔ (یادداشتہادی قزوینی ج ۱ ص ۱۴)

کردوچین کی تاریخ وفات کے بارے میں کوئی قطعی اطلاع نہیں، صرف تاریخ گزیدہ ص ۶۲۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۷۲۹ھ تک زندہ رہی، البتہ اتنا متحقق ہے کہ اپنی وفات تک وہ شیراز کی حاکم اعلیٰ رہی ہے، شیراز نامہ ص ۱۰۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے شوہر نوئین اعظم امیر طغای کی وفات کے بعد دو اور حاکم اس کے زیر نظر مقرر ہوئے۔ ایک کا نام حاجی طغی اور دوسری حاکم خود کردوچین کی بھانجی سلطان خاتون تھی وہ اپنے شوہر قرہ محمد کے ساتھ حکومت کے کام میں مشغول رہتی، لیکن حاکم اعلیٰ خود کردوچین ہی تھی۔ (کلی امور مملکت بہ نظر ایالت او منوط گردانیدند)

یہاں ایک امر کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ منگولوں کے تسلط کے دوران مسلمانوں کی شادیاں منگولوں سے برابر ہوا کرتی تھیں اور مسلمانوں کے نام بھی منگولوں جیسے ہوتے، ابش خاتون کی تین اولادیں تھیں جنکے نام یہ تھے۔

کردوچین، الغانجی (لڑکیاں) طایجو (لڑکا)

اگرچہ ابش خاتون کی شادی ہلاکو خاں کے بیٹے منکوتیمور سے ہوئی، لیکن ابش خاتون اور کردوچین دونوں کے بارے میں قطعی طور پر معلوم ہے کہ وہ مسلمان تھیں۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۲) ۷۰۱ میں ہوئی تھی (یادداشتہادی قزوینی ص ۱۴) مگر یہ قیاس درست نہیں اس لئے کہ کردوچین کا شوہر امیر طغای ۷۰۲ میں شیراز میں اپنی بیوی کردوچین کے ساتھ تھا (شیراز نامہ ص ۱۰۳)

بعض اعمال اور صحیح اسلامی نقطہ نظر

عبادت اور مظاہر عبادت خدا کے لئے مخصوص

از مولانا ڈاکٹر حبیب ریحان خاں ندوی *

اللہ تعالیٰ کائنات کا خالق، مبدع، مالک اور مدبر ہے اور اسے بنی نوع انسانی کی فلاح و بہبود آرام و راحت اور استعمال و منفعت کے لئے پیدا فرمایا ہے، سورج، چاند، زمین، پانی، ہوا، حیوانات، نباتات اور جملہ عناصر میں اس کی تجلی اور حکمت کار فرما ہے اور یہ سب بنی نوع آدم کی حیات و بقا اور قیامت تک اس کی نمود وارتقا کا سبب اور ذریعہ ہیں اور خدا نے انسانوں کو اپنی عبادت یعنی غلامی اور حکم برداری کے لئے پیدا فرمایا ہے کیونکہ کائنات کے ساتھ ساتھ وہ انسانوں کا بھی خالق ہے اور صرف خالق ہی نہیں بلکہ رب و مالک و آقا و حاکم بھی ہے، اس لئے شرعی عقلی اور فطری حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انسان اس کی عبادت کرے اور اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرے۔ اس کی ذات و صفات و افعال میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اس کی تدبیر و اختیار اور قضا و قدر اور مشیت تکوینی و تشریعی پر پوری طرح راضی برضا رہے۔ یہی اسلام الوجہ للہ اور اسلام القلب للہ کی نشانی ہے، یعنی خدا کی تابعداری چہرے کی بشاشت اور دل کی مسرت اور گہرائی سے ہو یعنی اس کا

* ناظم دار التصنیف والترجمہ۔ بھوپال۔

پورا وجود و احساس، دل و ضمیر، عقل و دماغ اور روح جس طرح اس کے وجود با وجود کا مظہر ہے اسی طرح اس کی تابعداری کا مظہر ہو۔

اسلام کے لغوی معنی میں سلامتی و امن اور تابعداری شامل ہے اور شرعی معنی میں یہ تابعداری خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور خدا کی تابعداری دنیا و آخرت میں مکمل امن و سلامتی کو وجود میں لاتی ہے اس لئے اولین و آخرین کا صحیح اور خدا کے نزدیک مقبول دین اسلام ہی تھا اور ہے، پیدائش سے پہلے ہی ان سے یہ عہد و پیمان لیا تھا کہ جب جب میرے رسول میری ہدایت لے کر تمہارے پاس آئیں تو تم ان کی پیروی کرنا۔

خدا نے انسانوں کے جسمانی وجود و بقا اور آسایش کے لئے جس طرح کائناتی نظام ایجاد کیا، اسی طرح ان کے ضمیر و وجدان، روح کی شادابی، سکون اور راہ مستقیم کی ہدایت کے لئے اسلام اتارا، انبیائے کرام اور رسولوں کو وحی پر مامور کیا اور اس آب نشاط انگیز سے دلوں کی طہارت کا انتظام کیا اور انسانیت کو صحیح اصولوں اور طریقوں پر چلنے کی تعلیم دی اور صرف عقل کی ظن و تخمین پر مشتمل اور صحیح و غلط اندازوں پر مبنی آرا کے بجائے وحی کی مستند اور صحیح روش اختیار کرنے کی تلقین کی تاکہ شیطانی وسوسوں، نفس امارہ کی خواہشوں اور مختلف و متنوع زیغ و ضلال کی وادیوں میں بھٹکنے سے محفوظ رہیں اور دین مستقیم پر چل کر خدا کی عبادت میں مصروف رہیں، اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور پوری زندگی کو خدا کی مرضی، وحی کی روشنی اور حکم الٰہی کے زیر سایہ گزارنا عبادت ہے نماز، روزہ، شادی بیاہ، تجارت اور معاملات اور جملہ امور زندگی میں شریعت کے احکامات و ممنوعات کا لحاظ کرنا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کو رضائے الٰہی کے جذبہ سے ادا کرنا عبادت ہے۔

خدا خالق و مالک اور حقیقی حاکم و مقنن (قانون ساز) ہے اس لئے اسلام میں عبادت اور بندگی صرف اللہ کی ہے، خدا نے اس کی اجازت نہیں دی کہ الوہیت و عبادت میں کسی کو بھی ذرہ برابر اس کے

ساتھ شریک ٹھہرایا جائے۔ لا الٰہ الا اللہ کے یہی معنی ہیں۔ بے شمار آیتوں میں سے صرف تین کا ترجمہ کیا جاتا ہے "لوگو! بندگی کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے لوگوں کا خالق ہے تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو (یعنی دنیا و آخرت کے فتنوں اور عذاب سے بچ سکو) وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا آسمان کی چھت بنائی اور آسمان (بادلوں) سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بہم پہنچایا، پس تم دوسروں کو اللہ کا مد مقابل نہ ٹھہراؤ" (بقرہ: ۲۲) دوسری آیت میں فرمایا "اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ" (نساء: ۳۶) تمام انبیائے کرام کی یہی دعوت رہی کہ "اے میری قوم والو! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے" (اعراف: ۵۹)

اسی طرح عبادت کے تمام مظاہر بھی خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔

سجدہ صرف اللہ کے لئے ہے تعبدی ہو یا تعظیمی ہو کیونکہ عظمت غیر اللہ بھی ان طریقوں سے ناجائز ہے جن میں ظاہرہ و شائبہ تعبد ہو ارشاد ہے "سجدہ کرو (جھک جاؤ) اللہ کے آگے اور بندگی بجالاؤ" (نجم: ۶۱) خالق کے علاوہ کسی اور مخلوق کو سجدہ کرنے کی ممانعت اس طرح ہے "اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند، سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اگر (فی الواقع) تم اس کی عبادت کرنے والے ہو" (حم السجدہ: ۳۷)

رکوع بھی اللہ کے لئے ہے (بقرہ: ۴۳)

قیام و قنوت بھی صرف اللہ کے لئے ہے، عاجزی سے غلاموں اور فرمانبرداروں کی طرح ہاتھ باندھے اور سر جھکائے ہوئے کھڑا ہونا غیر اللہ کے لئے صحیح نہیں اس عجمی عادت سے حضور پاک نے بھی منع فرمایا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے "اللہ کے سامنے اس طرح کھڑے ہو جیسے زباں بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں" (بقرہ: ۲۳۸) حقیقی تقویٰ، خوف و خشیت بھی اللہ کا حق ہے۔

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو خدا نے فرعون جیسے جابر و ظالم بادشاہ کے پاس ارسال کرنے کا حکم دیا، فطری طور پر انہیں اس کی زیادتی کا خوف ہوا تو خدا نے فرمایا "ڈرو مت میں تمہارے ساتھ ہوں سب کچھ سُن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں" (طٰہٰ: ۴۶) ارشاد الٰہی ہے "جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور صرف اللہ سے ڈریں اور اس کے (عذاب سے) بچنے کی کوشش کریں وہی درحقیقت کامیاب ہیں" (نور: ۵۲)

اخبات یہ ہے کہ صرف خدا کا ہو کر رہنا" توکل بھی اسی پر ہو اور یہ سمجھا جائے کہ وہی اکیلا کافی (حسب) اور کام بنانے والا" (ہود: ۲۳) "بس اگر یہ لوگ تم سے منھ پھیرتے ہیں تو اے نبی ان سے کہہ دو میرے لئے بس میرا رب کافی ہے اسی پر میں نے بھروسہ کیا" (توبہ: ۱۲۹)

ذکر اسی کا حق ہے، ہمہ لحظہ اس کی یاد اور خیال اور تسبیح و تمجید، اس کی پاکی بیان کرنا یعنی اس کی ذات ستودہ صفات کو تمام نقائص سے پاک کرنا جو مخلوقات کے ساتھ مختص ہیں "اے اہلِ ایمان اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو" (احزاب: ۴۲،۴۱) تہلیل اس کے ساتھ خاص ہے۔ تمام انبیا و رسل لا الٰہ الا اللہ کی دعوت دیتے رہے۔ تکبیر صرف اسی کے لئے موزوں ہے" ولذکر اللہ اکبر" (العنکبوت: ۴۵) اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے اللہ سب سے بڑا ہے، اسی کے لئے کبریائی ہے۔ کوئی مخلوق کبریائی کا حق نہیں رکھتی، نہ حاکم بڑا، نہ عابد و زاہد بڑا، نہ نفس کی خواہشات بڑی، اللہ اکبر اسی لئے اہلِ اسلام کا شعار بنا دیا گیا، نماز کی ہر تکبیر، اذان، عیدین ہر جگہ اللہ اکبر کا اظہار ضروری ہے۔

تحمید حقیقی بھی صرف اسی کی ہے، وہ جملہ انعامات و احسانات کرنے والا ہے اس لئے اس کی تلاوت ثنا ہے "الحمد للہ رب العٰلمین"۔ کلمۂ استرجاع بھی اسی کے دربار میں روا ہے۔

اہل ایمان پر جب مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں" اناللہ وانا الیہ راجعون" (بقرہ: ۱۵۶)
ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ حوقلہ اپنی بے طاقتی اور حیرت و پریشانی
پر خدا کی قوت و طاقت پر بھروسہ اس طرح کیا جاتا ہے" لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کوئی حیلہ
و قوت نہیں مگر اللہ کا دامن تھام کر۔

استغفار انابت گناہوں سے توبہ سب دربار الٰہی کے سوا کسی دوسری چوکھٹ پر روا نہیں۔
حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی نافرمان قوم سے کہا" اپنے رب سے معافی مانگو بے شک وہ بڑا
معاف کرنے والا ہے" نوح (۱۰) "جن لوگوں نے طاغوت (غیر اللہ) کی بندگی سے اجتناب کیا
اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا ان کو خوش خبری ہے۔" (زمر: ۱۷) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے
نفس پر ظلم کرنے والوں کو رحمت الٰہی سے مایوس نہ ہوتے ہوئے استغفار کرنے کا حکم دیا اور
بشارت دی کہ وہ سب گناہ معاف کر دیتا ہے وہ غفور و رحیم ہے (زمر: ۵۳) فلاح اور کامیابی
پانے کے لئے تمام اہل ایمان کو توبہ کا حکم عام دیا، صفات باری تعالیٰ میں سے گناہوں کو بخشنا
اور توبہ قبول کرنا بتایا گیا ہے" غافر الذنب و قابل التوب" (مومن: ۳) استفہامیہ انداز
میں لوگوں کو توبہ کی طرف اس طرح متوجہ کیا۔" کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ اللہ ہی ہے
جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور ان کی خیرات کو قبولیت عطا فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ بہت معاف
کرنے والا اور رحیم ہے۔" (توبہ: ۱۰۴)

ہر قسم کی دعا، طلب 'استعانت و مدد' مال و اولاد' شیطان اور دوسرے دشمنوں سے
تعوذ، پناہ اور اجارہ' بیماریوں سے شفا، دنیا و آخرت کی حسنات اور جملہ ضروریات صرف خدا سے
طلب کی جانی چاہئیں کہ دین خالص اس کا حق ہے (زمر: ۳) وہ زندگی بخشنے والا مارنے والا،
دوبارہ اٹھانے والا ہے۔ اس نے اپنا اقتدار و اختیار، نفع و نقصان اور منع و عطا کا حق نہ کسی

مقرب فرشتے کو اور نہ اپنے کسی معصوم نبی کو بخشا ہے۔ اس لئے عبادت کی طرح دعا و طلب استعانت
بھی خالص خدا کا حق ہے۔

قدیم زمانہ سے امم مشرکہ نے خدا کے ساتھ عبادت میں شریک بہت کم کیا ہے، لیکن دعا
و استعانت میں شرک برابر کئے جاتے رہے۔ دراصل دعا کی دو قسمیں ہیں دعاء العبادۃ اور
دعاء الاستعانۃ اور یہ دونوں قسمیں قرآن کی بے شمار واضح آیات کی رو سے اور عقل و منطق
کی رو سے اور شریعت کی ہر حکمت کے اعتبار سے خدا کے لئے مخصوص ہیں۔ بعض حضرات نے
قرآن میں دعا اور اس کے مشتقات کو عبادت ہی کے معنی میں لیا ہے جو بعض مقامات پر درست
بھی ہے لیکن اکثر مقامات پر دعا کے اصلی اور حقیقی معنی دعا کرنا پکارنا مدد مانگنا ہی ہیں۔
حکم خداوندی قرآن میں اس طرح ہے" مجھے پکارو میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔" (مومن:
۶۰) کیونکہ اس کے پاس قبولیت دعا کا کامل اختیار ہے۔ اہل ایمان نماز فرض یا نفل کی ہر رکعت میں
اس کا اعتراف کرتے ہیں۔" ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں" (الفاتحہ: ۵)
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا" اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو" (اعراف: ۱۲۸)
شیطان سے پناہ صرف خدا سے مانگنے کا حکم رسول پاک کو دیا گیا" جب قرآن پڑھو تو اللہ کی
پناہ مانگو شیطان ملعون سے" (النحل: ۹۸) دوسری جگہ اس طرح حکم دیا گیا ہے" اے نبی کہو یعنی دعا
کرو کہ پروردگار میں شیطان کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں بلکہ اے میرے رب میں تو اس سے
بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں" (المومنون: ۹۸-۹۷) خدائے پاک نے اپنے
رسول مقبول کی زبانی قرآن میں چند عظیم حقائق ان آیتوں میں واضح کر دیے" اے نبی کہو کہ میں اپنے
رب کو پکارتا ہوں (دعا کرتا ہوں) اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا، کہو میں تم لوگوں کے
لئے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں نہ کسی نفع کا، کہو مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا اور

نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پاسکتا ہوں، میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچادوں، اب جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی بات نہ مانے گا اس کے لئے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے" (الجن : ۲۳-۲۰)

غیر اللہ سے جو لوگ مدد مانگتے ہیں ان کی سعی رائیگاں کا نقشہ عجیب و لطیف انداز میں حضورؐ کی زبانی اس طرح پیش فرمایا "میرا ولی (ناصر و مددگار و حامی و سرپرست) وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت و ولایت کرتا ہے بخلاف اس کے تم جنھیں خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ نہ تمہاری مدد کرسکتے ہیں اور نہ خود اپنی ہی مدد کرنے کے قابل ہیں (اعراف : ۱۹۷)

اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں اور میدانِ حشر میں ان کی رسوائی اور حسرت کی تصویر بھی بار بار کھینچی گئی ہے۔

غزوۂ بدر میں فرشتوں کی آمد کو خوشی اور اطمینان کا باعث بتایا لیکن فتح و نصرت اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا اور دانا و بینا ہے" (آلِ عمران : ۱۲۶)

خدا تکلیف رفع کرنے والا ہے۔ سورۂ نمل میں تفصیل سے سوالیہ انداز میں پوچھا ہے کہ کس نے آسمان و زمین پیدا کئے پانی برسایا، باغات اگائے، زمین کو جائے قرار بنایا، دریا اور پہاڑ بنائے اس کے بعد فرمایا "کون ہے جو مضطر و بے قرار کی دعا سنتا ہے جب کہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے"۔ (النمل: ۶۱) اس کے بعد سوال کیا گیا ہے کہ بحر و بر کی تاریکیوں میں کون راہ دکھاتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا اللہ ہے؟ کون ہے جو خلق کی ابتدا و اعادہ کرتا ہے؟ اے نبی کہدو اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا اور وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کب وہ اٹھائے جائیں گے۔

آیتوں پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دعا کا سننا، قبول کرنا، تکلیف رفع کرنا

صرف اسی ذات کے قبضہ اختیار میں ہے جو خالقِ عالم ہے، آسمان و زمین، دریا، پہاڑ وغیرہ جیسی عظیم مخلوقات کو پیدا کرنے والا اور ان کو قائم رکھنے والا ہے، اس لئے کسی بھی مخلوق کے اختیار میں نہیں ہے، اسی لئے خدا تعالیٰ نے یہ حقیقت بار بار بے نقاب کی ہے، سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۵۶ و ۵۷ پیش ہے" اے نبی ان سے کہو جن کو تم خدا کے سوا (اپنا کارساز) سمجھتے ہو، ذرا انھیں پکار کر کے دیکھو وہ کسی تکلیف کو تم سے نہ ہٹا سکتے ہیں، نہ بدل سکتے ہیں، جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ تو خود اپنے رب کے حضور رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کررہے ہیں کہ کون اس سے قریب تر ہوجائے اور اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔

مچھلی کے پیٹ کی ظلمتوں میں جب حضرت یونس علیہ السلام نے خدا کو اس طرح پکارا "کوئی اللہ نہیں ہے مگر تو (نقائص سے) پاک ہے تیری ذات، بے شک میں نے قصور کیا، تب ہم نے اس کی دعا قبول کی اور غم سے اس کو نجات بخشی اور اسی طرح ہم مومنوں کو نجات دیا کرتے ہیں"۔ (الانبیا : ۸۸-۸۷)

خدا نے نبی کریمؐ کے ذریعے خدا کی عظمت و توحید، اس کی خصوصیات اور نقصان و تکلیف سے بچانے کا تذکرہ کس بلیغ انداز میں فرمایا ہے "رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں جو کچھ ٹھہرا ہوا ہے سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے، کہو اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا ولی (سرپرست و حامی و مددگار و کارساز) بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اور وہ جو سب کو کھلاتا ہے اور اسے کوئی نہیں کھلاتا، کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے سب سے پہلے میں اسی کے آگے سرِ تسلیم خم کردوں اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہوؤں، کہو اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے (خوفناک) دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی، اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے، اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے

تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ اپنے بندوں پر کامل اختیار رکھتا ہے اور دانا اور باخبر ہے۔" (الانعام : ۱۸ - ۱۲)

قرآن کی دعوت کا محور حقیقی ہی توحید کا اثبات، شرک سے اجتناب، اخلاص، عبادت صرف اللہ کی اور مظاہر عبادت بھی صرف اس کے ساتھ مخصوص، دعا، توبہ، طلب مدد و اعانت، دفع کربات، مصیبت، غم والم اور پریشانیوں سے چھٹکارے کے تمام اختیارات کا وہ اکیلا مالک، مارنا، جلانا، شفا بخشنا اسی کا حق ہے، اسی لئے تمام عظمتوں کا وہ مالک ہے، قسم صرف اسی کے نام سے منعقد ہوتی ہے نذر و نیاز بھی اسی کے لئے ہے، قربانی کا جانور اسی کے نام سے ذبح کیا جاتا ہے، جبرئیل امین علیہ السلام کے نام سے بھی اگر ذبح کیا جائے تو کھایا نہیں جا سکتا، تیسرے ہی لئے نماز ہے روزہ ہے۔

یہ تمام باتیں وہ ثابت شدہ حقیقتیں ہیں جو ائمہ سلف میں متفق علیہ تھیں لیکن بعد میں فارسی اور مجوسی مسیحی اور یہودی اور شرک پسندانہ افکار کی وجہ سے تعظیم غیر اللہ کے نئے نئے طریقے ایجاد ہوئے استعانت و مدد، طلب رزق و اولاد و قضائے حاجات و دفع کربات کے لئے زندہ آستانے اور مردہ دربار وجود میں آئے جو اپنی زندگی موت اور کسی بھی حاجت کو پورا کرنے کے لائق نہیں تھے۔ وہ مخلوق خدا کے قاضی الحاجات بنا لئے گئے کہیں حقیقی معنوں میں اور کہیں نہ درنہ غیر شرعی و غیر عقلی تاویلات کے ذریعے خدا کے تمام اختیارات گو زبانی طور سے اس سے سلب نہیں کئے گئے لیکن عملی طور پر بے شمار زندہ اور مردہ ان اختیارات کے مالک بن گئے، جو ایک سانس کے، ایک پانی کے قطرہ کے، ایک گیہوں کے دانہ کے مالک و مختار نہیں ہو سکتے وہ سب کچھ دینے والے بن گئے۔

اچھے خاصے علماء کی زبان و قلم سے بے تکلف "غوث اعظم" کا لفظ ایک بہت بڑے بزرگ کے لئے استعمال ہو جاتا ہے، حالانکہ غوث کے معنی کلی اور ہر قسم کی مدد کرنے والے کے ہیں۔

خدا کے سوا یہ لقب کسی اور کو کیسے زیب دے سکتا ہے اس کی ہزاروں ہزار قسم کی مدد میں سے ایک غیث ہے یعنی بارش جو بادلوں کے ذریعے ہوتی ہے، اس پر خدا کے سوا کوئی قدرت نہیں رکھتا تو دنیا و آخرت کی تمام مدد و نصرت اور مرادیں کوئی کیسے پوری کر سکتا ہے؟ بے تکلف کسی کو "گنج بخش" کہہ دیا جاتا ہے، گنج کے معنی خزانہ اور بخش کے معنی بخشنے والا۔ جب اس کائنات کا ہر خزانہ خدا کی ملکیت ہے تو اس کے سوا کسی دوسرے کو اس کے بخشنے کا حق کیسے دیا جا سکتا ہے؟ "حاجت روا" "مشکل کشا" اور "داتا" کے الفاظ بھی عام ہیں جو لغت، شریعت اور عقل و منطق کے ہر حساب سے صرف اللہ جل جلالہ کے لئے مناسب ہیں۔

تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں آج مزاروں پر جو کچھ ہو رہا ہے، زندہ آستانوں پر جس طرح تعظیم غیر اللہ کے ساتھ انسانوں کو عبودیت کی تعلیم دی جاتی ہے، علماء کے دربار میں ناحق چیزیں دیکھ کر ادب سے بھی کسی سوال یا تنقید یا لب کشائی کی اجازت نہیں ہے، یقیناً یہ صورت حال تکلیف دہ ہے جو مسلمانوں کی زبوں حالی کی ذمہ دار، اسلام کی حقیقی تعلیمات کے منافی ہے اور روزانہ نت نئی بدعات و ایجادات کا باعث ہے، اسے بدلنے کی سخت ضرورت ہے۔

یہ موضوع بہت اہم بھی ہے اور بہت طویل بھی۔ اس موقع پر اتنے ہی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اطاعت اللہ اور اللہ کے رسول کی سطور بالا سے یہ بات واضح ہو گئی کہ عبادت و مظاہر عبادت صرف اللہ کے لئے مخصوص ہیں، وہ مسبب الاسباب، خالق کائنات اور مدبر و رب و مالک ہے اس لئے اس کی اطاعت ضروری ہے اور چونکہ کائنات میں اس کی حکمرانی و فرمانروائی بھی ہے اس لئے تمام انسانوں پر بھی یہ واجب اور لازمی ہے کہ اس کے حکم، فیصلے اور مشیت پر زندگی گزاریں اور قرآن حکیم کی بنیاد پر اپنا پورا عباداتی، معاملاتی، سماجی اور قانونی نظام بنائیں کہ یہی ہدایت و نجات کا ضامن ہے، خطاب الٰہی رسول پاکؐ کی زبانی اس طرح ہے "اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی

بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو متنبہ کردوں (یعنی اس کے ذریعہ ڈراؤں)" (الانعام: ۱۹) ارشاد الٰہی ہے "بے شک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ اقوم (صحیح اور سیدھی) ہے" (بنی اسرائیل: ۹) اور حضور پاکؐ کو حکم دیا کہ "کہو (اعلان کردو) کہ حق آگیا اور باطل کی روح نکل گئی (مٹ گیا) اور باطل مٹنے ہی والا ہے اور ہم اس قرآن میں وہ نازل کر رہے ہیں جو مومنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کے لئے خسارے کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا" (بنی اسرائیل: ۸۱-۸۲) یقیناً قرآن پاک حق وصداقت کا پیکر ہے اور مومنوں کے قلبی امراض اور بیماریوں کے لئے شفا اور رحمت ہے، ظالم اس کی نفع رسانی سے کفر وانکار کی وجہ سے نقصان اٹھاتے ہیں، باطل مٹ گیا لیکن بظاہر باطل کی مادی بلندیاں اور قوت ونفوذ دیکھ کر یہ سمجھنا چاہئے کہ قرآن پاک نے اپنے عقلی وفکری تعلیم اور کائناتی دلائل کے ذریعے باطل کو مغلوب کر دیا ہے اور ہر زمانے میں باطل کی پُرفریب دلیلوں کا مسکت جواب قرآن پاک کے آفاقی وروحانی دلائل میں موجود ہے، آج بھی قرآن کی دعوت عام کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن ہی ہے، حضور پاکؐ کو قرآن ہی کے ذریعہ یاددہانی اور نصیحت کرنے کا حکم ہے (ق: ۴۵) دوسری جگہ ہے "اے اہل ایمان اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو" (آل عمران: ۱۰۲-۱۰۳) حبل سے مراد علی سبیل الاستعارہ کتاب الٰہی قرآن ہے جس طرح رسی کو مضبوطی سے پکڑ لینے سے آدمی اوپر سے نیچے نہیں گرتا اور مضبوط رسی کا نفع یہ ہے کہ اس کے ذریعے گہرے کنویں سے بآسانی پانی نکالا جاسکتا ہے اسی طرح قرآن واسلام پر چلنے سے بھٹکنے سے حفاظت ہوتی ہے اور دنیوی واخروی منافع حاصل ہوتے ہیں۔

اس لحاظ سے اللہ کی اطاعت اور کلام الٰہی کی اتباع واجب ہے اور درحقیقت اطاعت

اللہ ہی کا حق ہے لیکن خدا کی اطاعت کے تفصیلی احکام اور تعبیر وتشریح وتفسیر وتبیین قرآنی کون کرے گا؟ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے کتاب حق کے ساتھ رسول برحقؐ کو ارسال فرمایا اور ان کی اطاعت کا حکم قرآن کی بے شمار آیتوں میں دیا مگر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، عبادت تو صرف اللہ کی ہے اور مظاہر عبادات بھی صرف اللہ کے لئے مخصوص ہیں، خدا نے کسی فرشتے یا نبی کے لئے بھی ان کی اجازت نہیں دی ہے لیکن اطاعت کا حکم دیا گیا ہے کہ رسولؐ منشاء الٰہی کی وضاحت اپنی قولی وعملی سنت کے ذریعے کریں۔

مزید وضاحت یہ ہے کہ حکم الٰہی ہے کہ جو تم پر خدا کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو وحی کی دو قسمیں ہیں ایک قرآن پاک جو وحی متلو ہے اس کی تلاوت ثواب ہے، متعبد ہے، اس سے عبادت یعنی نماز ادا ہوتی ہے، دوسری وحی وہ ہے جو غیر متلو وغیر متعبد ہے، اس کے کسی بڑے سے بڑے مجموعے کو پڑھ لینے سے نماز ادا نہیں ہوسکتی لیکن تعمیل حکم اور اتباع میں وہ قرآن ہی کی طرح ہے، اس کا نام بعض لوگوں کے خیال کے مطابق حکمت اور سنت بھی ہے، اس سلسلے کی بعض وضاحتیں قرآن سے پیش کی جاتی ہیں "اور ہم نے یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس کی تبیین (تشریح وتوضیح وبیان) کرتے جاؤ جو ان کے لئے اتاری گئی ہے" (النحل: ۴۴) اور یہ تبیین وتوضیح آپ کے قول وعمل یعنی سنت ہی سے ہوسکتی ہے، یعنی وحی متلو کی وضاحت وحی غیر متلو کے ذریعے کرو اور یہ قاعدہ عام بھی قرآن پاک نے رسول پاکؐ کے لئے واضح کر دیا ہے "وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا بلکہ یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے" (النجم: ۳-۴) رسول پر اتاری جانے والی وحی میں ظن وتخمین کا دخل نہیں بلکہ وہ ہدایت کی ضامن ہے۔ ارشاد الٰہی ہے "اگر تم (رسول کی) اطاعت کروگے تو خود ہی ہدایت پاؤگے"۔ (النور: ۵۳)

عام رسولوں کی اطاعت کے سلسلے میں اصولی آیت یہ ہے "ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے

بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے (النساء: ۶۴) اسی لئے رسول پاکؐ میں ایک بہترین اسوہ (نمونہ) ہے "تمہارے لئے جو اللہ اور یومِ آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہو" (احزاب: ۲۱) اس لئے رسولِ پاکؐ کے حکم اور فیصلے کو قبول کرنا ضروری ہے فرمایا "جو رسول تم کو دے (یا فیصلہ کرے) اس کو قبول کرو اور جس چیز سے منع کرے اس سے رک جاؤ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو (ڈرو)" (الحشر: ۷)

اطاعت تو درحقیقت اللہ کی ہونی چاہئے یہ حقیقت درست ہے لیکن اگر اس سے کسی کو شبہ یا مغالطہ ہو رہا ہو تو خدائے پاک نے واضح الفاظ میں اعلان فرمادیا کہ جس نے رسول کی اطاعت کی درحقیقت اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی (النساء: ۸۰)

اطاعت رسول اللہؐ کی اہمیت اور وجوب کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خدا کی محبت کا دعویٰ بلا اطاعت رسولؐ مقبول نہیں، اتباع رسولؐ کو حب الٰہی کی علامت اور شعار بنا دیا گیا، ارشادِ الٰہی ہے "(اے نبی لوگوں سے کہہ دو) کہ اگر تم (حقیقت میں) اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کرو پھر اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو اللہ انکار کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا" (آل عمران ۳۱-۳۲) آیت کے آخر میں اطاعت خدا اور رسولؐ قبول نہ کرنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا گیا ہے اس لئے ایمان کی علامت یہ بتائی "تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے آپسی اختلافات میں تم کو حکم (فیصلہ کرنے والا) نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں" (نساء: ۶۵)

قرآن پاک میں اکثر مقامات پر خدا اور رسولِ خدا کی اطاعت ایک ساتھ بیان کی گئی ہے لیکن بعض جگہ صرف اطاعت رسولؐ کا تذکرہ ہے "نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور رسول کی اطاعت کرو"

تاکہ تم پر رحم کیا جائے" (النور: ۵۶) دنیا و آخرت میں کامیاب و بامراد ہونے والوں کی علامت یہ بتائی گئی "اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اور تقویٰ و خشیت (خوف اور ڈر) صرف اللہ سے کی تو وہی فلاح اور کامیابی پانے والے ہیں" (النور: ۵۲) مخالفتِ رسولؐ کا انجام بتایا گیا ہے "رسول کی مخالفت کرنے والوں کو ڈرنا چاہئے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آجائے" (النور: ۶۳)

ان چند آیتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہم تک پہنچانے والی ذات رسولِ پاکؐ کے سوا کوئی نہیں، قرآن کی تبیین یعنی غامض معانی و مسائل کو بیان کرنا، اجمالی احکام کی تفصیل بتانا جیسے نماز کی رکعات اور طریقہ، زکوٰۃ کی مقدار و طریقے، حج کے مناسک و مسائل، نکاح، طلاق، بیع و شراء وغیرہ کی جملہ تفصیلات، یہ سب آپؐ وحی کی روشنی اور خداداد حکمت کے زیرِ سایہ کرتے تھے اس لئے آپؐ کا قول و عمل و اقرار و سکوت سب دین میں حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپؐ اسوہ و نمونہ ہیں، آپؐ کے ہر حکم کی اطاعت اسی طرح واجب ہے جیسے اللہ اور قرآن کے حکم کی اطاعت واجب ہے۔

احادیث صحیح و غیر صحیح | وہ سنت رسول پاکؐ اور حکم نبیؐ جو قطعی الدلالۃ ہو یعنی صحیح اور مستند طریقوں سے ہم تک آیا ہو اور اس کی سند اور متن میں کوئی ایسا داغ نہ ہو جو اس کو رد کر دینے کا باعث ہو تو اس کی اتباع واجب ہے، قول و عملِ رسول کے جاننے میں صحت کا التزام اس لئے لازمی ہے کہ آپ کا ثابت شدہ قول و عمل شریعت ہے اور شریعت کو بے داغ اور شک و شبہ سے بالاتر ہونا چاہئے۔ علمائے جرح و تعدیل نے سند اور متن کی متعدد آفتوں کا ذکر کیا ہے۔ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ وضع حدیث سے آگاہ فرمایا تھا اور اس پر جہنم کی شدید وعید دی تھی۔ اس لئے موضوع من گھڑت اور جھوٹی حدیثوں کا انکار اور ان کے معائب کا اظہار فتنہ انکارِ حدیث

نہیں ہے بلکہ ان کا اقرار اور ان کو ماننا ان پر عمل کرنا اور ان کو پھیلانا سخت گناہ ہے، اسی طرح ضعیف احادیث سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہیں" واثمهما اکبر من نفعهما"، سلف میں سے امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ وغیرہ کے اس قول سے استدلال صحیح نہیں ہے کہ ضعیف حدیث بہتر قیاس وغیرہ کے مقابلہ میں افضل ہے، کیونکہ امام احمد کے زمانہ میں صرف دو قسمیں تھیں، اصطلاحی صحت کے لئے حدیث صحیح اور ضعیف میں تمام حدیثیں شامل تھیں جیسے صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ وغیرہ وغیرہ لیکن بعد میں ضعیف کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا یقیناً منکرات، شواذ اور ایسی عجیب وغریب احادیث پر عمل کس طرح صحیح ہوسکتا ہے جو صریح نصوص قرآنیہ اور صحیح احادیث کے خلاف ہوں یا ان سے عقاید واعمال میں زبردست بگاڑ کا اندیشہ ہو اور احداث فی الدین کا خدشہ ہو، یہ قول کہ ضعیف احادیث سے فضائل وثواب اعمال وغیرہ میں استدلال صحیح ہے اجماعی قول نہیں ہے لیکن اگر اسے بعض علماء کے قول کے مطابق مان بھی لیا جائے تو اس سے وہی ضعیف احادیث مراد ہوں گی جو سلف کے زمانہ میں حدیث صحیح کے بالمقابل بولی جاتی تھیں، وہ عجائب وغرائب مراد نہیں ہوسکتیں جن سے امام مسلم وغیرہ نے بھاگنے اور بچنے کی تلقین کی ہے، یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ دین نصوص کتاب اور نصوص سنت صحیحہ سے کامل ہوچکا ہے، وہ اپنے کمال کے لئے کسی ایسی چیز کا محتاج نہیں ہے جیسے قول رسول پاک ثابت کرنے کے لئے بے شمار بحثیں کی جائیں، اگر کوئی ایسی بات جو بہت ضروری ہو اور اس کے بغیر جینا مشکل ہو تو اسے اپنا لیا جائے لیکن آیات قرآنیہ وصحیح احادیث جس موضوع پر کامل طور پر تشفی قلب کا باعث ہوں وہاں ناقص الاعتبار حدیثیں اور ساقط الاعتبار چیزوں کی کیا ضرورت ہے؟ تیسری حقیقت یہ ہے کہ کسی عمل کی فضیلت یا ثواب ان ضعیف احادیث سے اگر ثابت بھی کیا جاسکتا ہو جو منکرات وآفات نہ ہوں تو بھی اصل عمل صحیح حدیث سے ثابت ہونا ضروری ہے، کیونکہ یہ دین شریعت ہے، مثال کے طور پر رجب یا شعبان کی کسی

نماز یا روزہ وغیرہ کا ثواب تو ثابت ہوسکتا ہے لیکن وہ نماز یا روزہ صحیح حدیث سے ثابت ہونا چاہئے کہ وہ عبادت ہے۔

یہ موضوع بھی بڑا اہم وطویل ہے، علماء کے اقوال کی روشنی میں اس کی تشریح کسی دوسرے موقع پر کی جائے گی، یہاں یہ تذکرہ اس لئے کیا گیا کہ بعض حضرات نے منکرات وعجائب وغرائب اور انتہائی ساقط الاعتبار حدیثوں پر گفتگو کرنے والے علماء کو فتنۂ انکار حدیث کا مجرم قرار دیا ہے یہ غلط ہے، انکار حدیث یہ ہے کہ صحیح وثابت سنت کو نہ مانا جائے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے منہ موڑا جائے۔ فارسی مجوسی کا اور یہودی ومسیحی سازشوں کے زیر اثر جب موضوع ومنکر وساقط الاعتبار حدیثوں کی ایجاد کا دور شروع ہوا اور اسرائیلی روایات تفسیر قرآن تک میں پھیلائی گئیں تو محافظین دین وکتاب وسنت اور فن حدیث کی عظیم ماہر جماعت نے اس کے سدباب کے لئے محیر العقول کارنامہ انجام دیا۔

یہ ضمنی بحث تھی، اصل میں یہ دکھانا تھا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واجب ہے اور آپ کی سنت پر عمل کے بغیر صرف قرآن پر عمل کرنے سے شریعت الٰہیہ مکمل نہیں ہوسکتی۔

اولوالامر کی مراد کی تعیین

اللہ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ اولوالامر کی اطاعت بھی واجب ہے اولوالامر سے مراد احناف کے نزدیک حکام اور امام مالک کے نزدیک علماء ہیں، حق یہ ہے کہ الحکام، العلماء اور العلماء الحکام مراد ہیں، سب سے پہلے اولوالامر حضرت ابوبکرؓ اور خلفائے راشدین اور علمائے صحابہ ہیں، اگر وہ کسی بات پر متفق ہیں تو ان کا اتفاق حجت ہے لیکن اختلاف ونزاع کی صورت میں خدا اور رسول خدا کی طرف مراجعت کا حکم دیا گیا ہے، رسول پاک کے وصال کے بعد یقیناً کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہی قیامت تک اختلاف کا حل اور نزاع کی صورت میں فیصلہ کن مانے جائیں گے، حکم "ردوا الی اللہ والرسول" کا دیا گیا ہے۔

کسی امام معصوم، کسی فقیہ بے مثال یا عالم باکمال کی طرف رجوع کا حکم نہیں دیا گیا کیونکہ اولوالامر فقہائے صحابہ کو یہ حکم دیا جا رہا ہے، صحابہ کرام ہر امام، عالم اور فقیہ سے زیادہ فقہ کے حامل تھے اولوالامر ہر زمانہ میں ایسے ہونے ضروری ہیں جو نصوص سے استنباط کی صلاحیت رکھتے ہوں اور نص قرآنی و نبوی سے اجتہاد و دلائل شرعیہ کے ساتھ، حسن نیت سے خدا کی مرضی سے قریب تر قول کو اختیار کریں (یہ دلائل علمائے کرام کے نزدیک معلوم و معروف ہیں) اگر وہ سب کسی ایک قول پر متفق ہوں تو اس پر عمل واجب ہے، اختلاف رائے و اجتہاد کی صورت میں بھی وہ عنداللہ ماجور ہوں گے اور دونوں قولوں پر عمل کی اجازت ہوگی.

اسلام کے اولین خلفاء مدت تک امراء یعنی حکام بھی تھے اور علماء بھی تھے پھر جب حکام علم کے اجتہادی مقام سے نیچے آگئے اور علماء حکومت سے دور ہوگئے تو اب حکام کو علماء کی طرف رجوع لازمی ہوگیا اور ان کے قول پر عمل ضروری ہوگیا اور شریعت پر چلنے کی صورت میں عوام پر حکام کی اطاعت فرض ہوگی۔

خدا کی اطاعت فرض ہے کہ حقیقتاً اطاعت اسی کی ہے اور رسول پاک کی اطاعت بھی غیر مشروط ہے کیونکہ وہ اللہ ہی کی اطاعت ہے، رسول کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جس کی اطاعت غیر مشروط ہو یعنی ہر حال اور حکم میں واجب ہو، اس سلسلہ میں ایک اصولی قاعدہ یہ ہے کسی مخلوق کی اطاعت اس چیز میں نہیں ہے جس میں خالق کی معصیت ہو، حضرت صدیق اکبرؓ امت کے پہلے اولوالامر افضل البشر بعد الانبیاءؑ نے اپنی پہلی تقریر میں فرمایا "میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کی اطاعت کروں"، اس لئے حکام و علماء، اساتذہ و اہل تعلق، ماں باپ، شوہر بیوی، اولاد و اقارب اور جن کی اطاعت و محبت کا حکم اللہ نے دیا ہے ان کی اطاعت اور ان سے محبت اس وقت تک کی جائے گی جب تک وہ معصیت اور گناہ کا حکم نہ دیں۔

رسول اللہ صلعم کے علاوہ کوئی مطاع مطلق و واجب الاتباع نہیں، سنت رسول اور اطاعت رسول کے وجوب پر امت کا سواد اعظم متفق ہے خوارج نے سنت کو تشریعی ماخذ نہیں مانا ہے اور طرح طرح کی تاویلیں کی ہیں، شیعہ اہل سنت کی جمع کردہ اکثر حدیثوں کو نہیں مانتے، اطاعت رسول کے قائل ہیں لیکن غیر معصوم کو امام معصوم بنانے کا نظریہ رکھتے ہیں، بعض مشائخ کے غالی متبعین بھی اپنے شیخ کو ہر حال میں واجب الاتباع مانتے ہیں، ان کے علاوہ امت کا ہر طبقہ قولاً و اعتقاداً یہ مانتا ہے کہ رسول پاک صلعم ہی معصوم ہیں اور ہر حال میں آپ ہی کی بات مانی جائے گی لیکن عملاً یا تاویلاً اکثر اوقات اپنے عالم، شیخ، استاد وغیرہ کو مطاع مطلق بنا دیا جاتا ہے، سلف صالح کے زمانہ میں عملاً بھی یہ بات نہیں تھی، اس میں تعصب اور کم علمی کا دخل ہے، اقوال صحابہ و تابعین، اجتہادات ائمہ اور جمود فقہائے امت سے ناواقفیت بھی ایک بڑا سبب ہے، ائمہ متبوعین میں سے امام اعظم کا یہ قول منقول ہوا ہے کہ "اگر صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا قول ہے"، امام شافعی نے اپنے یا کسی کے قول کو بلا دلیل ماننے سے روکا ہے، تمام اسلاف امت کا یہی شیوہ رہا ہے کہ غیر مختلف فیہ حدیث مل جانے کی صورت میں انہوں نے اپنے قول سے رجوع کر لیا ہے، اگر حضور پاک صلعم سے مسلسل دو عمل ثابت ہیں تو ائمہ کو اختیار ہے کہ ان میں سے جس کے پاس جو عمل صحیح ترین روایت صحابہ سے پہنچا ہے اس پر عمل کریں لیکن دوسرے عمل کو غلط یا بے اصل نہ مانیں، اگر قرآن کی دو آیتوں یا دو حدیثوں کے معنی میں اختلاف نظر آئے تو اس کی تطبیق کی جائے گی یا دونوں پر عمل کی کوشش کی جائے گی یا اجتہاد مجتہدین سے ایک قول کو ترجیح دی جائے گی، دوسرا مجتہد دوسرے قول کو ترجیح دے گا کسی کے خلاف لب کشائی نہیں کی جائے گی یعنی خدا یا رسول خدا کے کسی حکم کو خدا یا رسول خدا ہی کے کسی قول سے رد کیا جا سکتا ہے، ناسخ منسوخ، تقدیم و تاخیر، عموم و خصوص وغیرہ کے ذریعے علمائے امت نے اجتہاد اور فہم و فقہ کتاب و سنت کے تمام قواعد الحمد للہ مرتب کر دیئے ہیں، خدا اور رسول خدا کے قول کو کسی بھی شخص کی ذاتی رائے، ذوق یا وجدان سے رد نہیں کیا جا سکتا بلکہ ہر رائے، ہر حجت، ہر ذوق، ہر قیاس، ہر اجتہاد کو کتاب و سنت کی پاسبانی، نگرانی اور حجت و دلیل درکار ہے۔

بدعت کی حقیقت اور ممانعت گذشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ زندگی گزارنے کا صحیح اور بے خطر راستہ خدا نے وحی کے ذریعہ بخشا اور وحی کی دونوں قسموں اللہ کی کتاب اور سنتِ رسول کے ذریعے اسے کامل و مستحکم اور حفاظت کا ذریعہ بنایا۔ امام بخاری نے "کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ" باندھا ہے۔ یہ درحقیقت آیت قرآنی سے ماخوذ ہے۔ جس میں اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہنے کا تذکرہ ہے۔ ابن بطال کا قول ابن حجر نے لکھا ہے کہ "کسی کے لئے عصمت (وحفاظت وامن نہیں ہے غلطی سے) مگر کتاب اللہ میں یا سنت رسول میں یا علماء کے ایسے اجماع میں جو قرآن یا سنت کے کسی معنی پر ہوا ہو۔" (فتح الباری جلد ۱۳) گویا ان دونوں سرچشموں یا ان میں سے کسی ایک سے بھی مستنبط اجماعی معنی کے علاوہ دعوائے عصمت و محفوظیت نہیں کیا جا سکتا۔ حضور پاکؐ کا یہ قول متعدد روایات سے ثابت ہے کہ "سب سے اچھی بات کتاب اللہ ہے اور سب سے بہتر راہِ عمل ہدیٰ محمدؐ ہے اور سب سے برے کام نئے ہیں:"

نئے کاموں سے مراد یہ ہے کہ دین میں نئی نئی ایجادات اور طریقے نکالنا کیونکہ دین کامل ہو چکا ہے، کتاب اللہ نازل ہو چکی ہے، خدا نے اپنا احسان کیا کہ ایک نبی امی مبعوث فرمایا جس نے وحی کے ذریعے دین کی مکمل تشریح و توضیح کر دی۔ اب دین کے امور میں یعنی نماز، روزہ، خدا سے تقرب، طہارتِ نفس، تزکیۂ باطن و ظاہر وغیرہ کے لئے نئے نئے طریقوں کی ضرورت نہیں، نئی نئی نمازیں، نئے نئے روزے ایجاد نہیں کئے جا سکتے۔ حضور پاکؐ سے جو چیز جس طرح اور جس کیفیت اور جس انداز سے ثابت ہے اسی طرح کرنا سنت ہے اور اس کے خلاف کرنا بدعت ہے۔ اسی طرح مستحب کو فرض بنا دینا اور مکروہ کو حرام بنا دینا یعنی شرعی حکم میں اپنی طرف سے کمی یا زیادتی کر دینا بھی بدعت ہے۔

رسول پاکؐ دینی امور کو واضح کرنے، ثواب کے طریقے بتانے اور خدا کی رضامندی اور

جنت کے داخلے کے جملہ امور بتانے پر مامور کئے گئے تھے اور آپ نے تبلیغ رسالت میں کوئی کمی نہیں کی اس لئے اب کسی دوسرے شخص کی ضرورت باقی نہیں رہی جو ان میں اپنی طرف سے کوئی نئی راہ بتائے یا اس راہِ حق وعدل میں کوئی کمی یا زیادتی کرے، ارشادِ رسول پاکؐ ہے "سب سے برے امور نئے نئے ہیں اور ہر بدعت (دین میں نئی ایجاد) گمراہی ہے۔" (ابن داؤد، ترمذی۔ ابن ماجہ وغیرہ)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "جس نے ہمارے اس امر میں کسی نئی چیز کا اضافہ کیا وہ رد ہے"۔ (بخاری و مسلم وابوداؤد) یعنی جس نے دین کے امور میں کچھ اضافہ کیا وہ مردود ہے۔ کیونکہ احکام دین مقرر ہو چکے ہیں اور کسی نئی دینی چیز کی ضرورت نہیں ہے برخلاف مادی امور کے کہ ان میں تبدیلی ممکن ہے۔ گھوڑے کے بجائے موٹر پر بیٹھنا درست ہے لیکن نئی نمازیں یا عبادت کے نئے طریقے نکالنا صحیح نہیں۔

حضرت عرباضؓ بن ساریہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہؐ سے یہ کہتے سنا میں نے تم کو ملتِ بیضاء پر چھوڑا ہے جس کی رات دن کی طرح ہے جو بھی اس سے مائل ہوا وہ ہلاک ہوا۔" (کتاب السنۃ لابی عاصم) بیضاء کے معنی صحیح اور سفید چمکتی ہوئی آسان شریعت جو گمراہی سے محفوظ ہے جو بھی اس کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی طرف مائل ہوا وہ گمراہی کے گڑھے میں گر گیا۔

امام مالک نے فرمایا "جو شخص بھی کوئی بدعت ایجاد کرتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ محمدؐ نے رسالت میں غلطی کی حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "نبی نے رسالت پوری کی پوری پہنچا دی اور امانت اور راہِ خدا میں جہاد کا حق بھی ادا کر دیا۔"

بدعت کی جڑیں رہبانیت سے جڑی ہوئی ہیں اور کثرتِ عبادت وریاضت کے نام پر بہت سی بدعتیں ایجاد ہوتی ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں "سنت میں اقتصاد (میانہ روی)

بدعت میں اجتہاد (یعنی زیادتی) سے بہتر ہے، ارشاد نبوی ہے "جس نے میری سنت (طریقے) سے اعراض کیا وہ مجھ میں سے نہیں"۔ چند حضرات نے ازواج نبیؐ سے آپ کی گھریلو عبادات کے معاملے میں سوال کیا، جب ان کو آپ کے معمولات بتائے گئے تو وہ انہیں تھوڑے لگے۔ آپس میں کہنے لگے آپ کی کیا بات آپ کے تو سب گناہ معاف ہیں، ایک نے کہا میں تو رات بھر نماز پڑھتا ہوں سوتا نہیں۔ دوسرے نے کہا روزہ رکھتا ہوں کبھی افطار نہیں کرتا، تیسرے نے کہا میں شادی نہیں کرتا۔ جب آپ باہر تشریف لائے تو پوچھا "کیا تم لوگوں نے یہ باتیں کیں، پھر فرمایا میں تم میں سب سے زیادہ متقی اور (خدا سے ڈرنے والا ہوں) رات میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور بے روزہ بھی رہتا ہوں اور شادیاں بھی کرتا ہوں اور جس نے میرے طریقے سے اعراض کیا وہ مجھ میں سے نہیں"۔ (متفق علیہ)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کے قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ اخلاص نیت کے ساتھ ہو یعنی صرف خدا کے لئے ہو اور طریقہ سنت پر ہو، یعنی شریعت کے ماتحت ہو، من مانے طریقوں سے نہ ہو جن میں غلو یعنی زیادتی اور سختی ہو۔ دین الٰہی یسر یعنی آسان ہے اور جو اس میں شدتیں اور وہ بھی بدعت یعنی نئے طریقوں سے ایجاد کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ نقصان دہ ہے۔ صحابہ کرامؓ دین میں نئی چیزوں کے ایجاد کرنے سے سب سے زیادہ متنفر رہتے تھے اور تابعین و تبع تابعین اور علماء و فقہائے اسلام نے بھی ہمیشہ اس کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی، اس موضوع پر عربی اور اردو میں بہت لکھا گیا ہے۔ مولانا قاری مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری کے فتاویٰ کی مختلف جلدوں خصوصاً آخری جلد دہم میں اس پر بڑی اچھی اور مفید بحث موجود ہے۔

مگر آخری جلد میں کئی جگہ مولانا نے شیخ عبدالقادرؒ کے لئے "غوث الاعظم" کا لقب استعمال کیا ہے اس کی صحیح توجیہ راقم کی سمجھ میں نہیں آئی، غوث اعظم و غوث مطلق تو باری تعالیٰ کے سوا

کوئی نہیں ہو سکتا، راقم انشاء اللہ ان سے زبانی یا تحریری استفسار کرے گا۔ اگر یہ میری سمجھ کا قصور ہو تو واضح ہو جائے گا۔

اسی طرح مولانا نے سنت کی فضیلت پر مجدد صاحبؒ کے حوالے سے اچھی بحث کی ہے مگر اس میں زمین کی جنبش کرنے اور رک جانے کا قصہ اور سب سے آخر میں مجدد صاحب کی طرف منسوب یہ قول نقل کیا ہے "اگر فقیر دعا کرے تو انشاء اللہ سرہند شریف کے تمام مردے زندہ ہو جائیں"۔ اس کے متعلق راقم مودبانہ انداز سے یہ عرض کرتا ہے کہ ایسی روایتوں کی محققانہ (محدثانہ انداز میں) تنقیح ضروری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایسے قصے عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں، ان کے فائدے تو وہ اخذ نہیں کر سکتے۔ البتہ دین و دنیا کی ساری فلاح و سعادت بس کرامات ہی میں تلاش کرنے لگیں گے۔ دین کا ہر کام اسی طرح کرنا چاہئے جس طرح وہ نبی اکرمؐ سے ثابت ہو۔

غضیف بن الحارث الثمالی کہتے ہیں مجھے خلیفہ عبدالملک بن مروان نے بلوایا اور کہا اے ابوسلیمان ہم نے لوگوں کو ان دو چیزوں پر جمع کر دیا ہے۔ جمعہ کے دن (دعا کے لئے) ممبر پر ہاتھ اٹھانا اور دوسری یہ کہ فجر اور عصر کے بعد وعظ و نصیحت کے قصے سننے پر، میں نے کہا میرے نزدیک یہ تمہاری زبردست (افضل) بدعتیں ہیں، میں ان پر رضامندی ظاہر نہیں کر سکتا، عبدالملک نے کہا کیوں؟ انہوں نے فرمایا کیونکہ نبیؐ نے فرمایا جس قوم نے کوئی بدعت ایجاد کی تو سنت اس کے یہاں سے اسی قدر کم ہو جاتی ہے، اس لئے سنت پر تمسک نئی ایجادات (بدعات) سے بہتر ہے (ترغیب و ترہیب ۱:۸۶ رواہ احمد والبزار)

گو بعض مواقع پر دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا جائز ہے لیکن جمعہ کے دن منبر پر ہاتھ اٹھانے کو اس لئے بدعت کہا کہ حضور پاکؐ اور صحابہؓ کے زمانے میں جمعہ کے خطبہ میں ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کی جاتی تھی۔ اسی طرح وعظ و نصیحت ایک مشروع فعل ہے لیکن رسول پاک اس خوف سے کہ

اکتا نہ جائیں اسے کبھی کبھی کرتے تھے اور بعض صحابہ ہفتہ میں ایک دن اور کسی خاص موقع پر زیادہ سے زیادہ دو دن کرتے تھے، اب اس وعظ و نصیحت کو خاص دو وقتوں میں سب کے لیے ضروری کر دینا قطعاً مناسب نہیں ہے اسی لئے غضیف نے ایک غیر ضروری اور غیر لازمی فعل کو سب کے لئے ضروری اور لازمی کر دینے کو بدعت سے تعبیر کیا کیونکہ جس چیز کا موجب یعنی سبب موجود ہوا اور حضور پاکؐ یا اس امت کے اولین اولی الامر یعنی خلفائے راشدین و فقہا و علمائے صحابہ نے نہیں کیا تو بعد میں بھی اس کو کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جیسے عیدین میں اذان، عید کی نماز سے پہلے نوافل وغیرہ۔

حضرت ابن عمرؓ نے لوگوں کو چاشت کی نماز مسجد میں پڑھتے دیکھا تو فرمایا یہ بدعت ہے حالانکہ اس نماز کی تلقین خود حضور پاکؐ نے بخاری کی حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ کو کی ہے۔ اور آپ سے بھی کسی نہ کسی مناسبت سے یہ ثابت ہے جیسے سفر کی واپسی پر یا فتح مکہ کے دن وغیرہ، مگر ابن عمرؓ اور ابن مسعودؓ کے اس کو بدعت کہنے سے متعلق علماء نے یہ تاویلات کی ہیں کہ اظہار اعلان کر کے اسے مسجد میں پڑھنا یا فرض کی طرح لازم سمجھ کر پڑھنا یا جماعت سے پڑھنا وغیرہ، لیکن بہرحال صحابہ کرام کے اقوال کے زیر سایہ چاشت کی نماز کے بارے میں چھ اقوال وارد ہیں جیسے مستحب، کبھی پڑھنا اور کبھی نہ پڑھنا، کسی مناسبت سے پڑھنا مستحب اور بلا مناسبت پڑھنا بدعت وغیرہ، اب علماء و فقہاء کو اس کا اختیار ہے کہ مختلف اقوال میں دلیل کے ساتھ جس قول کو چاہیں ترجیح دیں، لیکن صحابہ کے کسی اجتہادی قول کو باطل اور غلط سمجھنا غلط اور ایک بڑی بدعت ہے۔

تراویح وباجماعت مسجد میں اور بیس رکعت پڑھنے کو بدعت کہنا اس لئے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت عمرؓ نے جو امت کے دوسرے ولی الامر تھے علماء و فقہائے صحابہ کی موجودگی

میں یہ کام کیا جو دراصل حضور پاکؐ کے کام ہی کا اجراء تھا کیونکہ آپؐ نے بھی باجماعت تراویح پڑھائی تھی، اس پر کسی صحابی، تابعی، تبع تابعی، فقہائے اربعہ وغیرہ نے نکیر نہیں کی اور دنیا کے اکثر ممالک اور مساجد میں اس کا رواج رہا تو اسے بدعت یا احداث فی الدین کہنا ناروا ہے لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ اگر کسی کی تحقیق میں بیس رکعت کا ثبوت نہیں ہوتا یا ہوتا تو ہے مگر پھر بھی وہ حضور پاکؐ کے عمل اور حضرت صدیقؓ کے عمل کے مطابق آٹھ رکعت پڑھتا ہے یا گھر میں پڑھتا ہے بشرطیکہ مسجد میں پڑھنے اور اجماع سلف امت پر لب کشائی نہیں کرتا تو اس کا یہ عمل بھی نہ بدعت ہے اور نہ اس پر نکیر کی جا سکتی ہے، امام مالک نے اہل علم کے لئے اگر مسجد سونی ہو جانے کا خطرہ نہ ہو تو گھر میں پڑھنا افضل بتایا ہے، ولی الامر کا اجماعی عمل اگر بدعت نہیں ہو سکتا تو حضور پاکؐ کے عمل پر عمل کرنا کیسے بدعت یا قابل نکیر ہو سکتا ہے؟

تراویح کے سلسلے میں آٹھ رکعات، ایک مالکی قول میں دس رکعات اور عام طور پر بیس رکعات کا قول ہے۔ بہرحال اگر تعصب و تنگ نظری سے اجتناب کرتے ہوئے غور کیا جائے تو ہر رمضان المبارک کے موقع پر برصغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش میں بیس رکعات اور آٹھ رکعات کے تعلق سے جو غیر ضروری بحثیں کی جاتی ہیں ان سے عام لوگوں کا فائدہ تو کچھ نہیں ہوتا البتہ ان کی الجھنیں بہت بڑھ جاتی ہیں، اس لئے ان کا دروازہ بالکل بند ہو جائے تاکہ امت کا انتشار افزوں نہ ہو۔

تکبیرات تشریق عام طور پر عرفہ کے دن فجر کے بعد سے شروع ہو کر ایام تشریق کی عصر تک ہوتی ہیں، حضرت ابن عمرؓ کے ایک قول پر صاحبین کا یہ قول ہے، مگر امام شافعیؒ و احمد بن حنبلؒ حاجی اور غیر حاجی میں فرق کرتے ہیں، غیر حاجی کے لئے تو عرفہ کے دن فجر بعد سے شروع ہوگی اور حجاج کے لئے قربانی کے دن دسویں تاریخ بعد نماز ظہر سے اور ختم ایام تشریق کے آخری دن عصر تک، امام مالک کے نزدیک حاجی و غیر حاجی سب کے لئے عید کے دن ظہر بعد سے آخری

ایام تشریق کی صبح تک، اس طرح صرف پندرہ نمازوں کے بعد ہوگی، امام اعظم ابوحنیفہؒ نے حضرت ابن مسعودؓ کے قول کو لیا ہے جس کی رو سے عرفہ کے دن فجر کی نماز کے بعد سے عید کے دن عصر کی نماز تک کل آٹھ نمازوں کے بعد ہوگی۔ فتح القدیر (ج ۲ ص ۸۱) میں امام صاحب کے قول کی دلیل اور توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اذکار میں اصل یہ ہے کہ اخفاء ہو اور جہر بدعت ہے (سوائے اس جگہ جہاں جہر ثابت ہو) چونکہ اس مسئلے میں صحابہ کرام سے اکثر و اقل دونوں طرح کے اقوال ملتے ہیں اس بناء پر اقل پر عمل کرنا زیادہ صحیح ہے، مگر صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ عبادات میں احتیاط ضروری ہے اس لئے اکثر والا قول لیا جائے۔

کیا امام اعظمؒ کی اس احتیاط کے باوجود ان کی شان میں گستاخی نازیبا ہے۔

خلیفہ وقت نے امام دار الہجرۃ امام مالکؒ سے ان کی کتاب الموطا کو سرکاری طور پر قابل اعتبار قرار دینے اور ہر جگہ اسی کی تعلیم دئے جانے اور دوسری سب کتابوں اور روایتوں کی تعلیم بند کر دینے کی قرارداد جاری کرنے کا ارادہ کیا تو علم کی حقیقت، سنت کی آفاقیت اور اقوال و روایات صحابہ کی جہانگیری و اہمیت کے قائل پیکر اخلاص و صدق و صفا امام مالک نے خلیفہ کو اس سے باز رکھنے پر اصرار کیا اور فرمایا کہ علم رسول پاکؐ صحابہ و تابعین کے ذریعے اسلام کے تمام صوبوں، شہروں اور علاقوں میں پہنچ گیا ہے، اس طرح وہ محدود ہو جائے گا اور کتمانِ علم کا موجب ہوگا، امام صاحب نے اسے ایک بہت نقصان دہ بدعت خیال فرمایا۔ جزاہ اللہ عنا و عن الامۃ الاسلامیۃ خیر الجزاء۔ لیکن آج کل کے علما کی کتابوں کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا تو وہ خوشی سے اچھل جاتے اور اسے اپنی غیر معمولی علمیت و مقبولیت کی دلیل بناتے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ عبادت یا مظاہر عبادت میں غیر اللہ کو شریک کرنا شرک بھی ہے اور بے شمار بدعتوں کے رواج کا باعث بھی ہے، اطاعت رسولؐ کا انکار یا

سنت کی مخالفت ہی بدعتوں کا سرچشمہ ہے۔

بدعتوں کا سلسلہ دراز ہے، کوئی سنت کو چھوڑ کر اپنے وجدان و ذوق پر دین کی بنیاد رکھتا ہے، کوئی سنت کے ساتھ اپنے ذاتی تجربوں یا دوسروں کے تجربوں کی بات کرتا ہے، کوئی مشکلات کے علاج کے لئے نئے نئے ایسے وظیفے اور ختم تجویز کرتا ہے جو زمانۂ سلف میں رائج نہیں تھے، کوئی اس سے آگے بڑھ کر مخالفتِ سنت کرتا ہے اور اتباع غیر الرسولؐ کو ہی عزیز جانتا ہے، شرعی ناموں اور اصطلاحوں کے بجائے دوسری اصطلاحیں ایجاد کرتا ہے، قرآن و سنت کے ہمہ گیر، دائمی طریقۂ اصلاح پر کسی مزید اصلاحی طریقوں کو ضروری سمجھتا ہے، کوئی کثرت عبادت کی دھن میں عبادت کے نئے نئے طریقے، ذکر کے عجیب عجیب انداز پیدا کرتا ہے اور طرح طرح کی تاویلات سے ان کو جائز کرنے کی کوشش کرتا ہے، کوئی غیر رسولؐ کے غیر مستند اور عجائب و غرائب سے لبریز قصوں اور تجربوں پر دینداری کی بنیاد قائم کرتا ہے اور بعض حضرات تو اس سب سے آگے بڑھ کر ہر طرح کی بدعات پر اصرار کرتے ہیں۔

بدعتیں کیسے ختم ہوں؟ راقم ایک طالب علم ہے، راقم کا خیال ہے کہ امت کے ہر طبقہ میں چھوٹی بڑی بدعتیں رائج ہیں اور ہر شخص دوسرے حلقہ کو بدعتی اور اپنے آپ کو سنت کا مکمل پابند سمجھتا ہے اور مناظرہ و مباحثہ کا بازار گرم رہتا ہے، بلکہ کبھی کبھی تو خوارج کا طریقہ یعنی کفر کے فتوے ظاہر ہوتے ہیں اور تفسیق و تضلیل تو ہر اس شخص کی کر دی جاتی ہے جو اپنی رائے کا مخالف ہو وغیرہ، ایسی صورتِ حال میں ضرورت ہے کہ ہر حلقہ اخلاص کے ساتھ کتاب و سنت و اجماع کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے حلقہ کی بدعتوں پر نظر ڈالے اور انہیں یکسر ختم کر دے ورنہ جب دوسرا حلقہ کوئی بدعت روا رکھتا ہے اور اسے منع کیا جاتا ہے تو وہ اس سے رکنے کے بجائے پہلے حلقہ کی بدعت کی نشاندہی کرتا ہے اور اس طرح لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اس کے لئے ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے کہ جو بھی دین کے کام حضور پاکؐ اور صحابہ کرامؓ کے زمانے میں نہیں ہوتے تھے اور تابعین و تبع تابعین ان سے نا آشنا تھے ان سب کو تمام طبقے مختلف مکاتب فکر اور امت کا ہر حلقہ چھوڑ دے اور تبع کے ساتھ سنت پر زندگی گزارے علماء کا یہ قول ہے کہ اگر کسی کام کے بدعت اور سنت ہونے میں شبہ یا تردد ہو تو اس کام کو چھوڑ دینا بہتر ہے، اگر کسی قول میں یہ بحث آجائے کہ اس کی نسبت حضور پاکؐ کی طرف صحیح ہے یا نہیں ہے تو اس کا چھوڑنا اولیٰ ہے۔

یہ بات تو یقیناً اہل علم کے نزدیک مسلم ہے کہ حکم خدا اور حکم رسولؐ کے درجات ہیں کچھ احکام فرض ہیں، کچھ واجب، کچھ سنت و مستحب و مباح ہیں حکم کی پابندی انہیں کے پیش نظر کی جائے گی۔ کسی مباح کام کو حرام کر دینا یا کسی مستحب کام کو فرض بنا دینا یا غیر لازم کو ہمیشہ لازم کر دینا یا عبادت و عادت کے فرق کو یکسر ملحوظ نہ رکھنا بھی غلط ہے کہ اس سے بڑی بڑی خرابیاں رونما ہوتی ہیں۔

الغرض بدعتوں سے بچنا خود بھی ضروری ہے اور دوسروں کو بچانا بھی ضروری ہے اس کے لئے مناظرہ، سب و شتم اور تفسیق و تکفیر کا طریقہ درست نہیں بلکہ خدائی طریقہ حکمت و موعظت حسنہ کو اختیار کرنا اور دلائل کتاب و سنت سے کام لینا ضروری ہے اور سچی ہمدردی اور رضائے الٰہی مقصود ہونی چاہیے۔

مالک رام اور غالب کے بعض بریلوی تلامذہ

از ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب *

اس مضمون میں غالب کے بعض ایسے تلامذہ پر نظر ثانی کی گئی ہے جن کا تعلق بریلی سے تھا اور جن کو مالک رام نے اپنی تالیف تلامذہ غالب میں شامل کیا ہے۔ اس جائزے میں ان امور پر روشنی ڈالی گئی ہے جو درست نہیں تھے اور مالک رام سے سہو ہوا۔ اس جائزے میں ان امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو درست تھے لیکن مالک رام نے ان کو قبول نہیں کیا۔

مالک رام کی تالیف تلامذہ غالب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔ مالک رام نے تلامذۂ غالب کی اشاعت ثانی کے وقت گلدستوں سے استفادہ کیا، بعض کا خیال انہیں دیر سے آیا تھا۔ انہوں نے بعض شعراء کو شامل کیا اور بعض شعراء کے حالات وغیرہ میں تبدیلی کی۔ انہوں نے تلامذہ غالب بار دوم ۱۹۸۴ء کے دیباچے میں تحریر کیا:

"تلامذہ کے لئے ایک اچھا ماخذ گلدستے بھی ہیں۔ افسوس کہ مجھے بہت دیر سے اس کا خیال آیا۔ اس میں جناب عبدالصمد خاں (اردو ریسرچ سنٹر احمد آباد) نے بہت مدد کی۔ ان کے پاس پرانے

---

* ۳/۲۰، پھول والان، بریلی۔ ۲۴۳۰۰۳۔

رسائل کا بہت اچھا اور بہت قیمتی ذخیرہ موجود ہے۔ افسوس کہ بوجوہ میں اس سے پورے طور پر استفادہ نہیں کر سکا۔ تاہم جو کچھ ہوگیا میں اس کے لئے ان کا شکر گزار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس دور کے گلدستوں کو بغور دیکھا جائے تو ضرور کچھ اور نام مل جائیں گے۔" (ص ۷)

حکیم جمشید علی خاں اختر بریلوی مالک رام کو گلدستہ نشو و نما بریلی کے شمارہ ستمبر ۱۹۰۳ء کے صفحہ تین پر حکیم جمشید علی خاں اختر کا نام ملا۔ غزل کا مطلع ہے:

اللہ باز آئیں جور و جفا سے آپ　　　　مرتے ہیں مرنے والے تو اپنی قضا سے آپ

(تلامذہ غالب۔ بار دوم۔ ص ۳۶ - بحوالہ سہ ماہی اردو کراچی ۵م: ۳،۲: ۲۲۳-۲۲۴)

اور انہوں نے حکیم صاحب کو تلامذہ غالب کی فہرست میں شامل کر لیا۔

بریلی میں رسائل کا عمدہ ذخیرہ ماسٹر لیاقت حسین لائق بریلوی (م ۶ دسمبر ۱۹۸۶ء) ساکن محلہ قصائی ٹولہ شہر کہنہ بریلی کے پاس محفوظ تھا اور جس سے مجھے استفادے کا موقع ملا۔ میں نے رسائل کے اس ذخیرے میں ہی محولہ بالا گلدستہ نشو و نما بریلی کو دیکھا تھا جس میں حکیم جمشید علی خاں اختر کی غزل بہ عنوان "حکیم جمشید علی خاں اختر تلمیذ غالب" شایع ہوئی تھی۔ حکیم جمشید علی خاں اختر کی وفات ۱۹۵۱ء میں ہوئی تھی اور میری نظر میں ان کی عمر بوقت وفات ۸۰ برس کے قریب ہوگی۔ حکیم صاحب چوراہہ کتب خانہ بریلی کے قریب نینی تال روڈ پر واقع مسجد جانی کے متصل ایک بڑے مکان میں رہتے تھے جس کے مردان خانے میں ان کا مطب تھا۔ اسی محلے (عقب کوتوالی بریلی) میں میری ننھیال تھی اور میں ان کو آتا جاتا دیکھتا تھا۔ میں نے اسی شبہ کے پیش نظر ان کو اپنے مضمون "بریلی میں غالب کے تلامذہ" (مطبوعہ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ۔ فروری ۱۹۶۹ء) میں شامل نہیں کیا تھا۔ جب مالک رام نے تلامذہ غالب کی اشاعت ثانی میں ان کو شامل کیا تو ان کے حالات کی تفتیش ضروری ہوگئی تاکہ ان کے تلمیذ غالب ہونے سے بوجوہ انکار کیا جا سکے۔

حکیم جمشید علی خاں اختر کے حالات ان کی حیات میں ہی حکیم فیروز الدین لاہوری نے رموز الاطبار میں شایع کرا دئے تھے (جلد ۲۔ ص ۴۴۲ تا ص ۴۴۳) یہ کتاب رام پور رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے (اردو مطبوعہ۔ طب یونانی۔ کال نمبر ۲۱۸ اور ۲۱۹) جس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ حکیم جمشید علی خاں اختر کا تاریخی نام "بلند اختر" (۱۲۸۷ھ / مطابق ۱۸۷۰ء) اور جائے پیدائش دلی ہے۔ ان کے والد کا نام حکیم منور علی خاں تھا۔ حکیم جمشید علی خاں اختر نے اس عہد کے علماء و حکماء سے عربی فارسی، منطق اور طب کی تحصیل کی اور سند مطب حکیم محمد اسلم خاں خستہ خلف حکیم محمد اعظم خاں دہلوی ثم جے پور نے عطا کی۔ انہوں نے کچھ دن دہلی میں مطب کیا اور کچھ عرصے بعد وہ ۱۸۹۹ء میں کسی رئیس کے علاج کے لئے بریلی تشریف لائے اور وہیں مستقل قیام فرمایا۔ (رموز الاطبار۔ جلد ۲۔ ص ۴۴۴ و ص ۴۴۵) بریلی کے محلہ خواجہ قطب میں حافظ غفور الدین تسلیم ڈپٹی انسپکٹر مدارس و تلمیذ مومن، ایک ماہ میں دو بار طرحی مشاعروں کا انعقاد کرتے تھے اور کلام شاعر گلدستہ نشو و نما بریلی میں شایع کراتے تھے جس کے مرتب گوپی ناتھ بے جین بریلوی تھے (عبد العزیز خاں عاصی بریلوی۔ تاریخ روہیل کھنڈ۔ ص ۲۸۵) اس وقت یہ بات طے کرنا ممکن نہیں ہے کہ حکیم جمشید علی خاں اختر جو غالب کی وفات ۱۸۶۹ء کے ایک سال بعد پیدا ہوئے تھے، کس وجہ سے یا کس بنیاد پر تلامذہ غالب میں شمار کئے گئے اور ان کے نام کے ساتھ تلمیذ غالب کا اضافہ ہوا، سہواً یا قصداً اور فریقین میں سے کس کی جانب سے ہوا۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ وہ غالب کے شاگرد نہیں تھے اور محض ایک گلدستے کے بالواسطہ حوالے سے ان کو فہرست تلامذہ غالب میں شمار کرنا غلط تھا۔

گلدستہ نشو و نما کے علاوہ بریلی کے جن گلدستوں میں ان کا کلام بعد کو شایع ہوا اور جو میری نظر سے گزرے ان میں ان تلمیذ غالب نہیں لکھا گیا ہے۔ مثال میں گلدستہ کمال دہلی بابت جنوری ۱۹۱۱ء میں ان کی غزل شایع ہوئی تھی جس کا مطلع ہے ؎

ہوا ہے ابر ہے صحن چمن ہے جام صہبا ہے
خدا رکھے تجھے ساقی یہ جلسا کیسا جلسا ہے

سرعنوان یہ تحریر ملتی ہے:

"اختر۔ جناب حکیم جمشید علی خاں صاحب دہلوی وارد حال بریلی۔"

دو غزلیات گلدستہ بہارِ سخن بریلی بابت ۶ جولائی ۱۹۲۹ء میں شایع ہوئی تھیں، صفحہ ۱۳ صفحہ ۶ جن کے مطالع مندرجہ ذیل ہیں:

اب ہم کو وصل یار کا ارماں نہیں رہا
یعنی دماغ منت و احسان نہیں رہا

یوں ہے دل بسمل نگاہ یار سے
جس طرح چورنگ اوڑتے تلوار سے

بطور عنوان یہ عبارت ملتی ہے:

"اختر۔ افتخار الشعرا جناب جمشید علی خاں صاحب بریلوی"

گویا بعد کو جو بھی مطبوعہ کلام دستیاب ہوا اس پر بطور عنوان ان کے نام و تخلص کے ساتھ تلمیذ غالب شایع نہیں ہوا۔

مفتی سلطان حسن خاں احسن بریلوی مالک رام نے تلامذہ غالب کی طبع اول میں مفتی سلطان حسن کا احسن تخلص منشی مہیش پرشاد کے حوالے سے تحریر کیا تھا (ص ۲۶) مالک رام نے تلامذہ غالب کی اشاعت ثانی میں مفتی سلطان حسن خاں کا سلطان تخلص درج کیا اور تبدیلی تخلص کی وجہ بتاتے ہوئے تحریر کیا:

"اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ منشی مہیش پرشاد مرحوم نے مجھے بتایا کہ مفتی سلطان حسن خاں کا تخلص احسن تھا۔ اس لئے میں نے اسی نام کے تحت ان کا کتاب کی طبع اول میں ذکر کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں کہ ان کا تخلص احسن نہیں بلکہ سلطان تھا۔ لہذا یہ تبدیلی کی گئی۔" ص ۲۸۳

ایوب قادری کا اعتراض ان کی کتاب "غالب اور عصر غالب" میں موجود ہے۔ انہوں نے

لکھا ہے:

"مالک رام نے بلا حوالہ سلطان حسن مرحوم کا تخلص احسن لکھ دیا ہے۔ تعجب ہے ڈاکٹر لطیف حسین ادیب نے بھی یہی بات دہرا دی ہے۔" (ص ۳۴۴)

میں نے ایوب قادری کے اعتراض سے قبل اپنے جن مضامین میں مفتی سلطان حسن خاں کا تخلص احسن تسلیم کیا تھا، وہ مضامین مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ بریلی کے خاندان مفتیان کی شاعری کا مختصر جائزہ۔ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ ۱۹۶۷ء۔

۲۔ بریلی میں غالب کے تلامذہ۔ " " فروری ۱۹۶۹ء

۳۔ شعرائے بریلی اور غالب۔ میگزین اسلامیہ کالج بریلی۔ غالب نمبر۔ ۱۹۷۰ء

مفتی سلطان حسن خاں کے تخلص احسن کی تائید میں مندرجہ ذیل امور کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

۱۔ منشی مہیش پرشاد نے مالک رام کو صحیح اطلاع دی تھی۔ منشی مہیش پرشاد خطوط غالب کی تلاش میں قاضی محمد خلیل بن قاضی عبدالجمیل جنون تلمیذ غالب کے یہاں گئے تھے اور وہیں ان کو مفتی سلطان حسن خاں کے احسن تخلص کا علم ہوا ہوگا۔ مفتی سلطان حسن خاں اور قاضی عبدالجمیل مفتی درویش حسن عثمانی بدایونی (م ۱۷۶۹ء) کی اولاد ہونے کی وجہ سے یک جدی تھے۔ باہمی تعلق خلوص و محبت کا تھا۔ مزید برآں مفتی سلطان حسن خاں کی صاحبزادی قاضی محمد خلیل کے عقد میں آئی تھیں۔ لہٰذا خاندانی روایت غیر معتبر نہیں ہوسکتی۔ مفتی سلطان حسن خاں کے صاحبزادگان میں مفتی عماد المحسن محو بریلوی (م ۱۹۲۶ء) بہت مشہور ہوئے۔ محو کے صاحبزادے مفتی صادق حسن صادق بریلوی (م ۱۹۸۶ء) بڑے کرم فرما تھے۔ وہ دوران گفتگو ہمیشہ مفتی سلطان حسن خاں کے ساتھ احسن ہی استعمال کرتے تھے۔

۲۔ خاندانی روایت کے علاوہ بعض دستاویزی شہادتیں بھی اہم ہیں۔ مثال میں رسالہ

"یادگار محو" مرتبہ صدیق احمد سالک برنی (م ۱۹۷۲ء) حسن پریس ٹاؤن ہال بریلی ۱۹۳۷ء کے صفحہ ایک پر یہ عبارت ملتی ہے:

"آپ کے والد ماجد مولانا مولوی مفتی حکیم حاجی سلطان حسن خاں صاحب احسن بعد ایام غدر مدتوں صدر الصدوری کے اہم فرائض انجام دیتے رہے"۔

میرا خیال ہے کہ ایوب قادری کی نظر سے رسالہ "یادگار محو" نہیں گزرا۔ ان کی تالیف "غالب اور عصر غالب" کی کتابیات (ص ۲۴۹ تا ص ۲۵۶) میں "یادگار محو" کا اندراج نہیں ہے۔ یہ رسالہ اب کمیاب ہو چکا ہے۔ میرے پاس اس کی دو نقول محفوظ ہیں۔

۳۔ مفتی صابر حسن شیوا عثمانی بریلوی (ثم کراچی۔ متوفی ۱۹۷۵ء) ابن مفتی عماد الحسن محو بریلوی ابن مفتی سلطان حسن خاں نے اپنے خط مورخہ ۵ مئی ۱۹۶۶ء بنام صدیق احمد سالک برنی تحریر کیا تھا:

"مجھے دادا صاحب کا ایک شعر یاد ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بت ہی پتھر کا کیوں نہ ہو احسنؔ — اچھی صورت پہ پیار آتا ہے

ناظر جی قبلہ کے اسی زمین میں دو شعر ہیں ؎

زاہد خشک جا کے مسجد میں — بوجھ سر کا اتار آتا ہے
دیکھ کر مجھ کو بولے بسم اللہ — بسمل دلفگار آتا ہے

[دادا صاحب سے مراد مفتی سلطان حسن خاں۔ ناظر جی سے مراد غلام بسمل اللہ بسمل تلمیذ غالب جو مفتی سلطان حسن خاں صدر الصدور کے ناظر عدالت تھے۔ متوفی ۱۸۹۶ء]

مفتی سلطان حسن خاں کا کلام تو نایاب ہو گیا لیکن ان کے نبیرہ نے ایک ایسا مقطع ضرور نقل کر دیا جس میں ان کا تخلص احسن ملتا ہے۔ مفتی صابر حسن شیوا عثمانی بریلوی نے راقم الحروف

کے نام خط مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۶۷ء میں بھی مفتی سلطان حسن کی وفات (۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء) کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا تھا:

"میرے جد بزرگوار حضرت مولانا الحاج مفتی سلطان حسن خاں صاحب احسن علیہ الرحمۃ بھی صدر اعلیٰ کے عہدے سے صدر الصدوری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے"۔

میں نے مندرجہ بالا شواہد کی بنیاد پر ہی مفتی سلطان حسن کا تخلص اپنے محولہ بالا مضامین میں احسن درج کیا تھا۔ میرے یہ مضامین ایوب قادری کے پیش نظر رہے جیسا کہ ان کی تالیف "غالب اور عصر غالب" کے حوالوں سے معلوم ہوتا ہے لیکن انہوں نے بدون تبصرہ تخلص سلطان کا اعلان کر دیا جس کو مالک رام نے بلا تامل قبول کر لیا۔

ایوب قادری نے سلطان تخلص کے ثبوت میں مفتی سلطان حسن کے ایک قصیدہ نعت کے، جو انہوں نے حج کے موقع پر لکھا تھا، دو شعر پیش کئے ہیں جن میں سے ایک شعر میں ان کا نام سلطان ملتا ہے ؎

مدینہ کی گدائی ہو کہیں سلطان کو حاصل — ملے بہر حسن اس کو یہ حصہ یا رسول اللہ

اس شعر سے واضح ہے کہ "مدینہ کی گدائی" کی رعایت سے سلطان نظم کیا گیا جو شاعر کا نام بھی تھا اور جس کو صرف تخلص سمجھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ مفتی سلطان حسن کا تخلص احسن ہی تھا جیسا کہ ان کے نبیرہ مفتی صابر حسن شیوا عثمانی کے فراہم کردہ مقطع سے معلوم ہوتا ہے۔ خاندانی روایات اور دستاویزات بھی تخلص احسن کے حق میں ہیں۔

میر بہادر علی حزیں مالک رام نے تلامذہ غالب طبع اول میں میر بہادر علی حزیں کو فہرست شعراء (ص ۱۴۱) میں بریلوی اور ترجمے میں (ص ۹۳) دہلوی تحریر کیا تھا۔ لیکن اشاعت ثانی کی فہرست شعراء میں (ص ۴۰) اور اس کے ساتھ ترجمے میں (ص ۱۵۵) صرف بریلوی تحریر کیا۔

درحقیقت میر بہادر علی کا تعلق بریلی سے نہیں تھا۔ کریم الدین نے طبقات الشعرائے ہند (۱۸۴۸ء) میں تحریر کیا ہے:

"حزیں تخلص نام میر بہادر علی ولد میر نجف علی پوتا مستقیم الدولہ میر علی بخش خاں بہادر کا جو بہت بڑے خوش نویس تھے۔ یہ دادا اس شخص کا۔ برادر زادہ نواب میر جملہ مرحوم کا ہے وہ سید صحیح النسب ہے۔ اس کے آبا و اجداد ہمیشہ سرکار فیض آثار بادشاہ میں باعزاز تمام رہے دادا نے اس کے مستقیم الدولہ خطاب پایا۔ منجملہ اور اعزہ اور روسا شہر شاہجہاں آباد کے یہ بھی ہے۔ چنانچہ اب تک میر بہادر علی مذکور اور اُن کی پوتی کا مشاہرہ سرکار سے جاری ہے۔ مرزا محمد سلطان فتح الملک شاہ بہادر کے مصاحبوں میں داخل ہے۔ اصلاح شعر کے زین العابدین عارف سے جو بندہ کے دوست ہیں لیتا ہے، دیوان طیار کرنے میں مصروف ہے۔ یہ چند شعر طبع زاد ہیں۔ عمر اس کی ۱۸۴۷ء میں ۲۵ برس کی ہے" الخ (ص ۴۳۶)

اسی بات کو دیگر تذکرہ نگاروں نے دہرایا ہے۔ مختصر یہ کہ میر بہادر علی حزیں اور اس کے اجداد دہلوی تھے۔ اس نے زین العابدین عارف کی وفات (۱۸۵۲ء) کے بعد غالب سے رجوع کیا تھا۔

قاضی عبدالرحمن وحشی میں نے قاضی عبدالرحمن وحشی بریلوی کا شمار تلامذہ غالب میں کیا تھا۔ (بریلی میں غالب کے تلامذہ۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ۔ فروری ۱۹۶۹ء) لیکن محمد ایوب قادری نے اپنی تالیف "غالب اور عصر غالب" میں ان کے تلمیذ غالب ہونے سے انکار کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"بریلی کے ایک خوش فکر شاعر عبدالرحمن وحشی تھے جو خاندان مفتیان بریلی کے ایک رکن تھے اس خاندان میں غالب کا چرچا تھا۔ جب غالب کے براہ راست شاگرد مفتی سلطان حسن خاں قاضی عبدالجمیل جنون اور غلام بسم اللہ بسمل وغیرہ رہگرائے عالم بقا ہو گئے، تو وحشی نے بھی

بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں غالب کے تلمذ کا ذکر و اعلان کر دیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس تلمذ کی کوئی اصلیت نہیں جیسا کہ بریلی و بدایوں کے واقفان حال سے ہمیں معلوم ہوا ہے۔" (ص ۱۸۴ و ص ۱۸۵)

ایوب قادری نے فٹ نوٹ میں تحریر کیا:

"ڈاکٹر لطیف حسین ادیب نے ان کو تلامذہ غالب میں شمار کر لیا ہے۔" (ص ۱۸۵)

چنانچہ مالک رام نے بھی قاضی عبدالرحمن وحشی بریلوی کو تلامذہ غالب میں شمار نہیں کیا حالانکہ یہ بات غور طلب ہے کہ انہوں نے حکیم جمشید علی خاں اختر کو گلدستہ نشو و نما بریلی بابت ستمبر ۱۹۰۳ء کی بنیاد پر غالب کا شاگرد تسلیم کیا تھا حالانکہ ان کی وفات ۱۹۵۱ء میں ہوئی تھی جس کا ذکر ایوب قادری نے "غالب اور عصر غالب" میں کیا تھا (ص ۱۸۵) اور جو مالک رام کے علم میں ہونی چاہیے۔ کیوں کہ "غالب اور عصر غالب" کی اشاعت تلامذہ غالب بار دوم کی اشاعت سے دو سال قبل ۱۹۸۲ء میں ہوئی تھی۔ غالب کی وفات اور حکیم جمشید علی خاں اختر کی وفات کے مابین ۸۲ سال کا فرق ہونے کی وجہ سے بادی النظر میں ہی ان کے غالب سے تلمذ کی نفی ہو جاتی ہے۔

قاضی عبدالرحمن وحشی بریلوی کی غزل ؎

جاں فروشی کا اگر دعویٰ عدو کرتے ہیں　　لیجیے ہم بھی تہ تیغ گلو کرتے ہیں

گلدستہ نہال سخن بریلی بابت جون ۱۹۱۴ء میں "تلمیذ غالب" کے ذکر و اعلان کے ساتھ شایع ہوئی تھی، اس وقت غالب کے کئی شاگرد زندہ تھے جیسے خواجہ الطاف حسین حالی (م یکم جنوری ۱۹۱۵ء) اور مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی (م یکم نومبر ۱۹۱۷ء) گویا جون ۱۹۱۴ء میں قاضی عبدالرحمن وحشی کا باعتبار عمر تلمیذ غالب ہونا خلاف قیاس نہیں تھا۔ ہاں یہ بات صحیح ہے کہ ۱۹۱۴ء میں بریلی کے تلامذہ غالب میں کوئی بھی زندہ نہیں تھا، لیکن ان کے پسران حیات تھے اور وہ خاندانی روایت علم و

ادب کی شمع روشن کئے ہوئے تھے۔ مفتی سلطان حسن خاں احسنؔ کے فرزند مفتی عماد الحسن محوؔ، قاضی عبد الجمیل جنونؔ بریلوی کے فرزند قاضی محمد خلیل حیرانؔ اور غلام بسمل اللہ بسملؔ کے فرزند عبدالرحمٰن کاملؔ سخن گو، سخن فہم اور سخن نواز تھے۔ خود مدیر گلدستہ نہال سخن بریلی حکیم فصیح الزماں امروہوی مفتیان وقاضیان بریلی کے حلقہ احباب میں شامل تھے اور فرداً فرداً نہال سخن میں شایع ہونے والے شعراء کی صلاحیت سے واقف تھے۔ مفتی عماد الحسن محوؔ اور مفتی بدر الحسن تفتہؔ ابن مفتی محمد حسن خاں اسیرؔ گلدستہ نہال سخن کے سرپرست بھی تھے۔ لہٰذا غالب پسندوں کے ہجوم میں مفتیان وقاضیان بریلی کے خاندان کے کسی بھی شاعر کا غالب سے تلمذ کا باطل دعویٰ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ خود قاضی عبدالرحمٰن وحشیؔ ایک سطحی ومفروضہ شخصیت نہیں تھے۔ وہ محمد حسن خاں اسیرؔ صدر الصدور مرادآباد کی ہمشیرہ نسبتی کے فرزند تھے اور وہ ہمیشہ مفتی عزیز الحسن ابن مفتی محمد حسن خاں اسیرؔ کے ساتھ رہے۔ مجھے یہ اطلاع مفتی صابر حسن شیواؔ عثمانی بریلوی ابن مفتی عماد الحسن محوؔ نے اپنے مکتوب مورخہ ۳ اپریل ۱۹۶۷ء میں دی تھی۔ ان حالات میں قاضی عبدالرحمٰن وحشیؔ کا اپنے ہی خاندان کے معزز شعراء کے سامنے تلمیذ غالب ہونے کا باطل ذکر واعلان خلاف فہم وقیاس معلوم ہوتا ہے۔

اصل میں ڈاکٹر ایوب قادری کو بتانا چاہئے تھا کہ قاضی عبدالرحمٰن وحشیؔ اگر غالب کے شاگرد نہیں تھے تو کس استاذ سخن کے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر ایوب قادری کو ان "واقفان حال" کے اسماء بھی درج کرنا چاہئے تھے جنھوں نے قاضی عبدالرحمٰن وحشیؔ کے تلمیذ غالب ہونے سے انکار کیا تھا اور جن کی ثقاہت کا جائزہ لے کر ان کی روایت کو پرکھ لیا جاتا۔

تاہم مفتی صابر حسن شیواؔ عثمانی اور مفتی صادق حسن صادقؔ پسران مفتی عماد الحسن محوؔ ابن مفتی سلطان حسن خاں احسنؔ تلمیذ غالب اور صدیق احمد سالکؔ برنی تلمیذ مفتی عماد الحسن محوؔ وہ بزرگ تھے جن سے میری یاد اللہ تھی اور یہ وہ بزرگ تھے جو خاندانی تعلق کی وجہ سے قاضی عبدالرحمٰن وحشیؔ کو غالب کا شاگرد بتاتے تھے۔ میں قاضی عبدالرحمٰن وحشیؔ کو غالب کا ہی شاگرد سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں ان کو تلامذۂ غالب بار دوم میں شامل ہونا چاہئے تھا۔

میں نے غالب کے متذکرہ بالا تلامذہ کے علاوہ غالب کے دو بریلوی تلامذہ پر علیحدہ مضامین لکھے تھے:

۱۔ "تلمیذ غالب مفتی سید احمد خاں سیدؔ بریلوی"۔ غالب نامہ دہلی۔ جنوری ۲۰۰۰ء۔
۲۔ "تلمیذ غالب قاضی عبدالجمیل جنونؔ بریلوی"۔ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ اکتوبر ۲۰۰۰ء۔

ان دونوں مضامین میں بھی مالک رام کے "تلامذہ غالب" میں پیش کردہ تراجم کا جائزہ لیا گیا ہے اور بخوف طوالت وتکرار ان کو اس مضمون میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

مالک رام نے تلامذہ غالب تالیف کرکے ایک کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے تلامذہ غالب کی اشاعت ثانی کے وقت اپنے کام پر نظر ثانی کی تھی لیکن اس قدر اہم اور معیاری کام کو پائیدار بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس پر نظر ثانی کا عمل جاری رہے۔ میں نے یہ کام شعرائے بریلی کے حوالے سے کیا ہے، دوسرے شہروں کے افراد اپنے شہروں کے حوالے سے یہ کام کرسکتے ہیں۔

مراجع

ایوب قادری۔ ڈاکٹر۔ محمد۔ غالب اور عصر غالب۔ اسحاقیہ پریس کراچی۔ ۱۹۸۲ء۔ احترام الدین احمد شاغلؔ جے پوری۔ تذکرہ شعرائے جے پور۔ یونین پرنٹنگ پریس دہلی۔ ۱۹۵۸ء۔ ابرار علی صدیقی بدایونی۔ آئینہ دلدار۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۵۶ء۔ خلیق انجم۔ ڈاکٹر۔ غالب کے خطوط۔ جلد ۴۔ ٹمر پرنٹرز دہلی۔ ۱۹۹۳ء۔ ضیاء القادری بدایونی۔ محمد یعقوب۔ اکمل التاریخ۔ جلد ۱۔ مطبع قادری بدایوں۔ ۱۹۱۶ء۔ عبدالعزیز خاں عاقل بریلوی۔ تاریخ روہیل کھنڈ۔ مکتبہ علم وفکر کراچی۔ ۱۹۶۳ء۔ فیروز الدین۔ حکیم لاہوری۔ رموز الاطباء۔ جلد ۲ مخزونہ رامپور رضا لائبریری، رام پور، کریم الدین۔ مولوی۔ طبقات الشعرائے ہند۔ مطبع العلوم دہلی ۱۸۴۸ء

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ایڈیشن ۱۹۸۳ء ۔ مالک رام ۔ تلامذہ غالب طبع اول ۔ مرکز تصنیف و تالیف نکودر ۱۹۵۷ء ۔ مالک رام ۔ تلامذہ غالب طبع ثانی ۔ برقی آرٹس پریس دہلی ۱۹۸۴ء ۔

گلدستے

گلدستہ کمال دہلی ۔ مدیر پیارے لال رونق دہلوی ۔ ماہ جنوری ۱۹۱۲ء ۔ مخزونہ راقم الحروف ۔ گلدستہ بہار سخن بریلی ۔ مرتب ۔ ماتا پرشاد استھانہ زیب بریلوی ۔ ماہ جولائی ۱۹۲۹ء " " ۔ گلدستہ نہال سخن بریلی ۔ مدیر حکیم فصیح الزماں امروہوی ۔ ماہ جون ۱۹۱۳ء ۔ مخزونہ شری ویریندر پرشاد سکسینہ ۔ بدایونی ۔ گلدستہ نشوونما بریلی ۔ مرتب گوپی ناتھ بے چین بریلوی ۔ ماہ ستمبر ۱۹۰۳ء ۔ مخزونہ ماسٹر لیاقت حسین بریلوی ۔ شہر کہنہ ۔ بریلی ۔

مضامین

بریلی میں غالب کے تلامذہ ۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب ۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ۔ فروری ۱۹۶۹ء ۔ بریلی کے خاندان مفتیان کی شاعری کا جائزہ ۔ ایضاً ۔ ایضاً ۔ اگست ۱۹۶۷ء ۔ شعرائے بریلی اور غالب ۔ ایضاً ۔ میگزین اسلامیہ کالج بریلی ۔ غالب نمبر ۔ مرتب ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی ۔ ۱۹۷۰ء ۔

خطوط

مکتوب صابر حسن شیوا عثمانی بریلوی ثم کراچی ۔ بنام راقم الحروف ۔ مورخہ ۳ ؍ اپریل ۱۹۶۷ء ۔ ایضاً ۔ مورخہ ۲۲ ؍ فروری ۱۹۶۷ء ۔ ایضاً ۔ صدیق احمد سالک برنی ۔ مورخہ ۵ مئی ۱۹۶۶ء ۔

غالب مدح و قدح کی روشنی میں (حصہ دوم)

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

اس میں مرزا غالب کی شاعری کی حمایت و مخالفت میں ۱۹۲۹ء سے ۱۹۶۹ء تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے ۔ قیمت ۵۰ روپے ۔

بچوں کا ادب اور ہمارے ادبا و شعراء

از ڈاکٹر محمد حسین فطرت بھٹکلی ۔

"بچوں کا ادب" جس قدر اہم موضوع ہے اتنا اسے قابل اعتنا و التفات نہیں سمجھا گیا ۔ حالانکہ بچوں کی بنیادی تعلیم و تربیت ہی ایوان مستقبل کا سنگ بنیاد ہے ۔ میں جب اپنے زمانہ طالب علمی میں تحصیل علم میں کوشاں تھا ۔ اس وقت ہمارے اردو نصاب میں متعدد ادبا و فضلاء کے ادب پارے شامل تھے ۔ بالخصوص سرسید، مولانا حالی ۔ مولانا راشد الخیری، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت دیا شنکر نسیم کے ادب پاروں سے استفادے کے مواقع حاصل تھے ۔

مولانا راشد الخیری کے رشحات قلم کی دلگدازی ضرب المثل کی طرح مشہور ہے ان کے مضامین میں حزن و ملال کی عکاسی و غمازی کا یہ عالم ہے کہ غم جو ایک غیر مرئی چیز ہے محسوس پیکر کا روپ دھار لیتا ہے ۔ گویا صفحہ قرطاس پر الفاظ نہیں بلکہ مظلوم و مجبور کے آنسو بکھرے ہوئے ہیں ۔ یا غم و اضطراب کے مرمریں اصنام ڈھل گئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو مصور غم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔

ان کی تصانیف جہاں بڑوں کے لئے مفید و موعظت بردوش ہیں بالکل اسی طرح طلبہ اور نوجوانوں کے لئے دل پذیر اور سبق آموز ہیں ۔ مولانا راشد الخیری مشرقی تہذیب کو دل و جان سے عزیز رکھتے تھے ۔ ان کو مغربی سیلاب میں ہر چیز ڈوبتی نظر آ رہی تھی ۔ مولانا نے اسی مغربی سیلاب میں

عورتوں کی حیا کو ڈوبتے دیکھا اور اپنی ساری ادبی صلاحیتیں صنف نازک کی اصلاح و ترقی کے لئے وقف کردیں۔ شام زندگی، صبح زندگی، سیدہ کا لال وغیرہ آپ کی مایہ ناز تصانیف ہیں۔

اسی طرح ہم نصابی کتب میں خواجہ حسن نظامی کے ادب پاروں سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ ہماری ادبی صلاحیتوں کی نشو و نما میں ان کی رعنائی افکار اور شوخی گفتار کو بڑا دخل ہے۔ موصوف کے خامۂ معجز نما کے جلال و جمال کا حال کیا عرض کروں، حسن رقم اور کمال فن کا یہ عالم ہے کہ گونگے الفاظ کو زبان گویا حاصل ہوتی تھی۔ قلم باذن اللہ کا ورد پڑھ کر بے جان الفاظ میں وہ ایک نئی روح پھونک دیتے تھے۔ دیا سلائی اور الو جیسے پیش پا افتادہ عنوان کو گنجینۂ معنی بنا دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے ان کو مصور فطرت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی انشا پردازی کے اچھوتے انداز اور انوکھے خیال سے بعض مضامین کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ کون ایسا اردو داں ہے جس نے ان کا مضمون "الو" نہ پڑھا ہوگا۔ اس مضمون میں مولانا نے اپنی علمی ذکاوت اور لطیف مزاج اور تصوف میں غلطاں رجحان سے عجیب و غریب سماں پیدا کردیا ہے۔

سرسید مرحوم کے مضامین سے بھی ہم نے اپنے طالب علمی کے دور میں خوب خوب خوشہ چینی کی ہے۔ ان کے ادب پاروں سے اردو ادب اور اردو لٹریچر کا صحیح فہم ہم کو عطا ہوا اور ہم متعدد اخلاقی قدروں سے بخوبی متعارف و روشناس ہوئے۔

کامل اردو کی مشاطگی میں سرسید کا نمایاں حصہ ہے۔ انہوں نے اردو ادب کو دل کش باوقار اور ذی اعتبار بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس وقت اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے قیام نے اردو نثر کی کایا پلٹ دی تھی مگر اس سلسلے میں سرسید کی امتیازی شان کچھ اور ہی ہے گو انہوں نے آثار الصنادید میں وہی قدیم اسلوب بیان اختیار کیا تھا جس میں الفاظ کا شکوہ عبارت آرائی، مقفّٰی نگاری، تشبیہات کی بھرمار استعاروں کی فراوانی سب کچھ ہے لیکن یہ ان کی دور اندیشی کی

عمدہ مثال ہے کہ جب آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو آسان اردو اور سادہ زبان کا اہتمام تھا۔ آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن ہی اردو کے اسلوب بیان کے لئے مشعل راہ بنا۔ بلکہ تہذیب الاخلاق کا بھی اردو ادب کی فلاح و صلاح کے سلسلے میں مہتم بالشان حصہ ہے نہ صرف یہ کہ سرسید نے اسلوب بیان پر ہی زور دیا بلکہ علمی، اخلاقی، مذہبی، سیاسی، تاریخی اور فلسفیانہ مضامین پر بھی توجہ صرف کی۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجرا بھی اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں ممد و معاون رہا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مشاطگی کا کل ادب کا سلیقہ ہمارے اندر پیدا کرنے میں ہمارے درسی نصاب کی گوناگون خصوصیات اور اس کے اعلیٰ معیار کو بڑا دخل ہے۔ اپنی تعلیمی کدو کاوش کی داستان سرائی کو میں نامکمل اور تشنہ سمجھوں گا۔ اگر میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کے خامۂ افسوں طراز کی عکاسی و غمازی نہ کروں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ادب پارہ "فسانۂ آزاد" لکھنؤ کی سوسائٹی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ سرشار کا یہ کارنامہ نہ صرف ادبی حیثیت سے قابل قدر ہے بلکہ تہذیبی اور تاریخی سرمایہ میں بھی ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ اس دور کے لکھنؤ کی تہذیب پورے طور پر فسانۂ آزاد کے کردار میں سموئی ہوئی ہے۔ ایک زوال آمادہ تمدن کی جو بھی خاصیتیں ہوتی ہیں سب "فسانۂ آزاد" کے صفحات پر بکھری نظر آتی ہیں۔ جاگیردارانہ نظام کی برکتیں اور ان برکتوں کے فیوض سے جو کچھ اثرات شخصیات پر مرتب ہوتے ہیں ان سب کی تفصیل "فسانۂ آزاد" میں ملتی ہے۔ سرشار نے لکھنؤ کی روزمرہ زندگی کو کچھ اس طرح اس میں پیوست کردیا ہے کہ وہ اپنے خد و خال کھو چکنے کے بعد بھی 'فسانۂ آزاد' میں زندہ جاوید بن گئی ہے۔ "فسانۂ آزاد" میں ہر قسم کا مزاج ملتا ہے۔ طبقاتی تقسیم نے ہماری زندگی میں جس قسم کے مزاج کو جنم دیا ہے سرشار نے اس کو بڑی خوبی اور فنی چابکدستی کے ساتھ مورد اظہار کیا ہے۔ ایک طبقہ "پدرم سلطان بود" کی صہبائے تند سے مخمور ہے تو دوسرا طبقہ صد درجہ لاابالی پن، عیش پرستی، بے پروائی اور شکم پروری کا شکار ہے۔ سرشار کے زمانہ میں

لکھنؤ بھانڈوں کی ظرافت کا مرکز تھا، لیکن سرشار کا کمال فن یہ ہے کہ اس نے ابتذال کو بھی ایک ادبی جمال بخشا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے بھی اپنے گرانقدر نثری افکار و نقوش سے بچوں کے ادب کو نگارخانہ تعلیم وثقافت بنایا۔ ان کی بعض تصنیفات مثلاً 'ابن الوقت'، 'توبۃ النصوح' وغیرہ نے افسانہ نگاری میں ایک نئی طرح ڈالی، یوں تو افسانہ اور حقیقت میں بعد المشرقین ہوتا ہے۔ مگر ڈپٹی صاحب کے خارا افسوں طراز نے افسانے کے اندر حقیقت کو اس طرح گھول دیا جیسے شیر و شکر کا امتزاج ہوتا ہے بچوں کی دینی و اخلاقی تربیت میں نذیر احمد کے افسانوں نے ناقابل فراموش حصہ ادا کیا ہے۔

اس طرح اور بھی ادبا و شعرا کے اسما قابل ذکر ہیں جنھوں نے اپنی گرانقدر نگارشات سے بچوں کے ادب کو مالا مال کیا۔ مولانا شبلی نعمانی، مولوی اسمٰعیل میرٹھی، علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، حامد اللہ افسر، شفیع الدین نیر، تلوک چند محروم اور چکبست لکھنوی جیسے شعرا و فضلا نے بچوں کے ادب کو گہوارۂ تہذیب و تمدن بنایا۔

مولانا شبلی نے بے شمار تاریخی واقعات کو منظوم شکل میں پیش کیا۔ بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر نہایت آسان اور عام فہم زبان میں تاریخی حقائق کو صفحہ قرطاس پر مرتسم کرنا گویا انہیں کا حصہ ہے۔ انہوں نے فاروق اعظم، مساوات اسلام، عدل جہانگیری، جنگ احد میں حضرت حمزہؓ کی شہادت جیسی معرکۃ الآرا نظمیں بچوں کے لئے پیش کیں۔ جن کی معنی خیزی اور ندرت بیان کا جواب نہیں۔ تدریسی و تعلیمی کتب میں مولانا شبلی نعمانی کے نثری فن پارے بھی اردو ادب کا نادر و نایاب نمونہ ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے مضامین میں مصر کی قدیم یادگاریں، ترکوں کے اخلاق و عادات اور طرز معاشرت وغیرہ مضامین نثری و ادبی جواہر پاروں کا درجہ رکھتے ہیں۔

حامد اللہ افسر بھی بچوں کی نفسیات کے بڑے ادا شناس تھے۔ وہ اپنی ہلکی پھلکی نظموں کے

وسیلے سے بچوں کے دل میں اترنے کا فن جانتے تھے۔ ان کی نظمیں گویا بچوں کے خوشنما اور رنگین کھلونے ہیں، جن کی کشش اور دلآویزی بچوں کے ذہن و دل کو مسخر کر لیتی ہے، چاند کے عنوان پر مجھے ان کا ایک مصرع یاد ہے۔ جس میں ادب کے جمال و جلال کی عکاسی کی گئی ہے۔ عام آدمی دریا کے کنارے پر رات کو چاند کا سماں دیکھتا ہے تو اس کی عکاسی یوں کرتا ہے کہ دریا کے کنارے چاند کا منظر بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایک شاعر اسی بات کو بڑے دلکش اور اچھوتے انداز میں یوں پیش کرتا ہے ؎

"تم ندی پر جاکر دیکھو جب ندی میں نہائے چاند"

بالفاظ دیگر اپنے مافی الضمیر کو نہایت پرکشش اور دلنواز انداز میں بیان کرنا ادب کا دوسرا نام ہے اور شاعری کا فن بھی ایسی ہی منظر کشی اور افسوں طرازی سے عبارت ہے۔

علامہ اقبال نے بھی اپنے شعری و ادبی گلکاریوں سے بچوں کے ادب کو سبد گل اور کف گلفروش بنایا۔ انہوں نے بچوں کے ادب پر اپنی خصوصی توجہ صرف کی۔ طلبہ کے اندر حصول علم کی لگن پیدا کرنے میں ان کے ادبی گل و لالہ نے ناقابل فراموش حصہ لیا ہے۔ ان کی بعض نظمیں مثلاً "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" اور "ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا" "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اور "جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں" اور "آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ" یگانہ روزگار ہیں۔ جن کی کیفیات و تاثر کو کبھی فراموش و نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کی ایک طویل نظم زیر عنوان "چاند اور شاعر" کے کچھ اقتباسات یہاں پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ؎

اک رات میرے دل میں جو کچھ آگیا خیال — یوں چودھویں کے چاند سے میں نے کیا سوال
پائی ہے چاندنی یہ کہاں سے بتا مجھے — یہ نور یہ کمال کہاں سے ملا تجھے
تو وہ دیا ہے جس سے زمانے میں نور ہے — ہے تو فلک پہ، نور ترا دور دور ہے

میرا سوال سن کے کہا چاند نے مجھے
لو بھید اپنے تجھ کو بتاتا ہوں میں تجھے

سورج کے دم سے مجھ کو یہ حاصل کمال ہے
کامل اسی کے نور سے میرا ہلال ہے

پھرتا ہوں روشنی کی تمنا میں رات دن
رہتا ہوں میں کمال کے سودا میں رات دن

مجھ کو اڑائے پھرتی ہے خواہش کمال کی
کر پیروی جہاں میں میری مثال کی

بچوں کے ادب کی تشکیل کے سلسلے میں اپنی پرخلوص کاوشوں کا مظاہرہ کرنے والوں کی فہرست میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی بے شمار نظمیں اردو کے تعلیمی نصاب کی روحِ رواں ہے۔ انہوں نے بچوں میں تعلیمی واخلاقی روح پھونکنے کے سلسلے میں ایسی نادر ونایاب چیزیں پیش کی ہیں جن سے ہزاروں طلبا اکتساب فیض کرتے رہے ہیں۔ بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر ہلکی پھلکی نظموں کے ذریعے پتے کی باتیں بتلانا ان کے قلم کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ طول بیان سے دامن بچاتے ہوئے ایک نظم کے اشعار پر اکتفا کرتا ہوں ؎

بنایا ہے چڑیوں نے جو گھونسلا
سو ایک ایک تنکا اکٹھا کیا

گیا ایک ہی بار سورج نہ ڈوب
مگر رفتہ رفتہ ہوا ہے غروب

قدم ہی قدم طے ہوا ہے سفر
گئیں لحظے لحظے میں عمریں گزر

درختوں کے جھنڈ اور جنگل ہرے
یوں ہی پتے پتے سے مل کر بنے

لگا دانے دانے سے غلے کا ڈھیر
پڑا لمحے لمحے سر برسوں کا پھیر

جو ایک ایک پل کٹ کے دن کٹ گیا
دنوں ہی دنوں میں برس گھٹ گیا

ہوئی لکھتے لکھتے مرتب کتاب
اسی پر ہر اک شے کا سمجھو حساب

ہر اک علم و فن اور کرتب ہنر
نہ تھا پہلے ہی دن اسی ڈھنگ پر

یوں ہی بڑھتے بڑھتے ترقی ہوئی
جو نیزہ ہے اب پہلے تھا وہ سوئی

جلاہے نے جوڑا تھا ایک ایک تار
ہوئے تھان جس کے گزوں میں شمار

اگر تھوڑا تھوڑا کرو صبح و شام
بڑے سے بڑے کام ہوں گے تمام

زمانۂ طالب علمی میں پڑھے ہوئے "پانی" کے عنوان پر دو تین شعر ہنوز مجھے یاد ہیں ملاحظہ ہوں ؎

خدا نے دی ہے تم کو عقل و تمیز
ذرا دیکھو یہ پانی بھی ہے کیا چیز

یہ مل کر دو ہوؤں سے بنا ہے
گرہ کھل جائے تو فوراً ہوا ہے

نہیں کرتا کسی برتن سے کھٹ پٹ
ہر اک سانچے میں ڈھل جاتا ہے جھٹ پٹ

العلم فی الصغر کالنقش فی الحجر کے مصداق پرائمری درجے میں پڑھے ہوئے مولوی اسمٰعیل کے اور بھی بہت سے اشعار ہنوز میرے برزبان ہیں مثلاً ؎

شام کا وقت یا سویرا ہو
چاندنی ہو کہ گھپ اندھیرا ہو

لیکن پر ہول دل نہ میرا ہو
کیونکہ میرا خدا ہے میرے ساتھ

یادش بخیر لڑکپن کے زمانہ میں میں جب پرائمری کے اول درجے میں تھا ہماری اردو کتاب میں حسب ذیل حمد موجود تھی۔ استاد محترم نے اس حمد کو ہمیں یاد کرایا تھا۔ آج بھی اس وقت کی حمد خوانی کا سرور ذہن و وجدان میں زندہ و پائندہ ہے۔ بچپن میں پڑھی ہوئی وہ نظم میں بھول نہیں سکتا۔ ملاحظہ ہو ؎

سبز پروں کا پیارا طوطا
باتیں کرنے والی مینا

اجلے بالے والا بگلا
مچھلیاں کھانے والا بگلا

بڑ پر بیٹھنے والی کوئل
کوکنے والی کالی کوئل

حمد خدا کی سب گاتے ہیں
اس کا شکر بجا لاتے ہیں

سچ پوچھئے تو ادبیات اطفال ایوان مستقبل کے لئے سنگ بنیاد کی حامل ہیں ان کی روح پروری الاذہن سازی مسلمات کا درجہ رکھتی ہے۔

معارف کی ڈاک

فیروز بخت احمد صاحب کا ایک بیان

حبیب منزل، میرس روڈ علی گڑھ

۲۲-۲-۲۰۰۱ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

فروری ۲۰۰۱ء کے معارف میں جناب امین مسعود صدیقی کے معروضات اور ان پر آپ کے حواشی کے دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر صرف ایک امر کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، اگرچہ یہ معروضہ بھی بارِ خاطر ہے لیکن ایک اصولی بحث کے طور پر عرض کیا جارہا ہے۔

فیروز بخت احمد صاحب کا بیان ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بھتیجے (مولانا غلام یٰسین آہ مرحوم کے صاحب زادے) جناب نورالدین احمد صاحب نے ان کی والدہ نازنین بیگم صاحبہ سے دہلی میں مولانا آزاد کی کوٹھی میں نکاح کیا تھا اور وہ ان کی اولاد ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نکاح کے موقع پر خود مولانا آزاد دہلی سے باہر تھے لیکن فلاں فلاں اصحاب (میری یادداشت کے مطابق ان اصحاب میں انہوں نے محمد اجمل خاں صاحب اور بیرسٹر نورالدین احمد کے نام لئے ہیں) موجود تھے۔ جب فیروز بخت احمد صاحب حیات تھے۔ انہوں نے اس کی تردید فرمائی اور کہا کہ میں نے کبھی کسی خاتون سے نکاح نہیں کیا اور میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ فیروز بخت احمد صاحب نے نکاح میں جن اصحاب کی شرکت بیان کی تھی ان میں سے کوئی اس وقت بھی بقید حیات نہیں تھا جو اس کی تصدیق یا تکذیب کرسکتا۔ گویا یہ مسئلہ نورالدین احمد صاحب مرحوم اور فیروز بخت

احمد صاحب کے درمیان نزاعی بن گیا تھا۔ اس صورت میں بارِ ثبوت فیروز بخت احمد صاحب کے سر ہے نہ کہ ان لوگوں کے سر جو نورالدین احمد صاحب مرحوم کے بیان کو صحیح گردانتے ہیں اور پھر اس پروپگنڈے کی ضرورت کیا ہے کہ میں مولانا آزاد کا پوتا ہوں؟

نیاز مند

ریاض الرحمٰن شروانی

دسمبر کے معارف پر ایک نظر

٭ جناب عزمی خیرآبادی کا ۱۳ جنوری کو انتقال ہوگیا، اِنّا للّٰہ الخ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے آمین۔ مرحوم اس عاجز سے بڑی محبت کرتے تھے اور معارف کے نہایت قدرداں تھے ان کا یہ والا نامہ فروری کے شروع یا جنوری کے آخر میں ملا تھا، اس مہینہ میں اس کے لئے جگہ نہیں نکل سکی، دنیا کی زندگی کتنی ناپائدار ہے کہ مکتوب الیہ کے خط کی اشاعت ان کی وفات کے بعد ہورہی ہے۔ (معارف)

مکرمی! سلام مسنون

دسمبر کا معارف آج ۳۰ دسمبر کو ملا۔ نگارشات حسب معمول شاندار ہیں۔ شذرات پڑھ کر یہ شعر یاد آگیا۔ پتہ نہیں کس کا شعر ہے۔

نہ کیا ذبح گیا چھوڑ کے بسمل قاتل
دہن زخم پکارا کیا قاتل قاتل

تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ آپ صرف اشارہ کردیتے ہیں کہ فلاں فلاں جلسہ میں گیا۔ تقریر کی مگر اس کی تفصیل معارف میں نہیں ہوتی۔ میں کئی مرتبہ لکھ چکا ہوں کہ آپ ان مجالس میں جو تقریر کرتے ہیں ان کو من و عن شایع بھی کردیا کریں تاکہ ان سے ہم جیسے دیہات میں بسنے والے لوگ بھی مستفید ہوسکیں۔ لیکن آپ کو ہماری بسملیت پسند ہے۔

آخری چار سطری شذرہ باجپئی جی سے "منسوب" ہے۔ ارے صاحب ع

یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں

شعر ملاحظہ ہو

ان بتوں سے وفا کی امیدیں — تم بھی عزمی کمال کرتے ہو

یہ وہی باجپئی جی ہیں جنھوں نے بابری مسجد کے انہدام کو شرمناک بتایا تھا اور آج فرماتے ہیں کہ رام مندر کی تعمیر قومی جذبات کی آئینہ دار ہے۔

ہندو ایک بہت بھولی بھالی معصوم اور مخلص قوم ہے۔ یہ صرف چند سرپھرے فرقہ پرست ہیں جو نفرت کی ہوائیں چلا رہے ہیں اور بغض و نفرت کے بیج بو رہے ہیں اور ہندوستان کی تباہی کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ خدا رحم کرے۔

"امام محمد بن الحسن الشیبانی" مولانا عبدالحلیم چشتی کا مضمون بہت پسند آیا۔

پروفیسر نذیر احمد کا مضمون "ہندوستان کے مشرقی کتاب خانے ..... بہت اچھا اور معلوماتی مضمون ہے۔ ملحوظ خاطر رہے کہ انھوں نے کتاب خانے لکھا ہے۔ کتب خانے نہیں جو آج کل کے اکثر ادیب استعمال کرتے ہیں۔ صحیح لفظ کتاب خانہ ہی ہے۔

محمد بدیع الزماں صاحب کا مضمون "اقبال کے کلام میں ..... صفحہ ۴۴ پر شایع ہوا ہے اس میں تلمیح کی یوں تعریف کی ہے:

"تلمیحات کے معنی یہ ہیں کہ کم از کم الفاظ سے بلاغت پیدا کی جائے ...."

حالانکہ تلمیح کے معنی ہیں "اشارت کردن بہ قصہ مشہور" اس لئے

خشت اول چوں نہد معمار کج — تا ثریا می رود دیوار کج!

تعجب ہے کہ آپ کی نظر اس پر نہیں گئی ....

محترم سید سبط محمد نقوی کا مکتوب دیکھا آپ کے اس نوٹ نے طبیعت خوش کردی

اور مجھے اس پر کچھ لکھنے سے بچالیا۔

"مکتوب نگار کے الفاظ میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی ..." جو بیس پچیس سطروں میں کہنا تھا آپنے ایک سطر میں کہہ دیا۔ اسے کہتے ہیں بلند ایجاز نگاری۔ مبارک باد۔

قمر سنبھلی کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے لیکن ان کی یہ نظم "اے ارض فلسطین" کوشش کے باوجود ہضم نہیں کرسکا۔ کسی بہت عمدہ شاعر کے یہ شعر ملاحظہ کریں۔

دامن قدس میں اردن کے جواں لیٹے ہیں — دیکھ رضواں ترے مہمان کہاں لیٹے ہیں

یہ شہیدان محبت، یہ شہیدان وفا — جن کو تربت نہ ملی جن کا جنازہ نہ اٹھا

نرغۂ غیر میں اپنوں نے جنھیں چھوڑ دیا — ان کو مرعوب نہ ہتھیاروں کی کثرت نے کیا

عقل کی گھات میں آئے نہیں دیوانے تھے — بے خطر کود پڑے آگ میں دیوانے تھے

الفاظ کی ہم آہنگی نے اشعار کو وہ حسن عطا کیا ہے کہ باید و شاید۔ غالباً معارف کو شعر و سخن سے دلچسپی نہیں ہے۔

عبدالصدیق صاحب کے تبصرے خوب ہوتے ہیں، وہ کتاب کا عرق نکالتے پھر اس سے عطر کشید کرتے اور پھر اسے قارئین معارف کے سپرد کردیتے ہیں اور ذہن زخم پکارتا رہ جاتا ہے ... قاتل ... قاتل۔ والسلام مع الاکرام۔

خادم: عزمی خیرآبادی

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڑھ

نام مقام اشاعت : دارالمصنفین اعظم گڑھ — پتہ : دارالمصنفین اعظم گڑھ

نوعیت اشاعت : ماہانہ — نام پبلشر : "

نام پرنٹر : عبدالمنان ہلالی — ایڈیٹر : ضیاءالدین اصلاحی

قومیت : ہندوستانی — قومیت : ہندوستانی

نام و پتہ مالک رسالہ دارالمصنفین

میں عبدالمنان ہلالی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ عبدالمنان ہلالی۔

ادبیات

اشعار نظیری

من روزۂ خانہ خمار ندانم   مستیِ طرب جز بہ شب تار ندانم

چون کودکِ پُر خشم بود گریہ حدیثم   صد عرض ہوس دارم و گفتار ندانم

عمرم بہ صفیر قفس و دام گذشت است   من زمزمۂ در خور گلزار ندانم

خاموش ز غوغا کہ درین باغ نظیریؔ   یک نغمہ بصد شاخ سزاوار ندانم

غزل باردیف تغیر

از پروفسور محمد ولی الحق انصاری٭

بردوش اگر رشتہ زنار ندارم   از کفر، مگو، ہیچ سروکار ندارم

صد معنیِ روشن بدلم جلوہ کند لیک   الفاظ مناسب پی اظہار ندارم

صد نکتہ باریک حقایق بہ سرم ہست   اما چہ کنم، محرم اسرار ندارم

گیرد چہ ز من دستِ ستمگار زمانہ   من چیزِ دگر جز بہ غم یار ندارم

نا بینا ام و بہرِ نشان دادن خود را   در دست چراغی بہ شب تار ندارم

بت گشتہ ام از جلوہ آن بت کہ ز حیرت   در پای خودم جنبش و رفتار ندارم

رختِ خودم انداختہ در میکدہ چون را؟   در مسجد و بتخانہ و فرخانہ ندارم

در صومعہ آیم بتو فردا بہ شب ای شیخ   در راہ اگر خانۂ خمار ندارم

٭ دار الامان۔ ۲۷۔ فرنگی محل لکھنؤ۔

انبار مضامین نوین است بہ اتمام   آیید و بگیرید کہ بسیار ندارم

جنسیت گران مایہ من صورت اشعار   در ہند ولی گرمی بازار ندارم

حیرانم و افسردہ کہ این را چہ کنم من   بس قیمتی کالاست و خریدار ندارم

اشعار سرایم کہ بگویند حریفان   در درجِ خودم گوہر گفتار ندارم

ای اہل چمن در گذر از صوت کریہم   "من زمزمۂ در خور گلزار ندارم"

ولی الحق ہستم و حق جویم و حق گویم و حق بین

واما پی شہرت ہوسِ دار ندارم

غزل

از جناب رئیس احمد نعمانی٭

یہ دھار دھار ہوائیں یہ زخم زخم احساس   الٰہی! تیرے کرم پر ہے زندگی کی اساس

یہ حشر خیز تباہی، یہ حادثوں کا ہجوم   وَاَنْتَ اَعْلَمُ مَا کَانَ فِی صُدُوْرِ النَّاس

لکھوں تو کیا لکھوں ان زلزلوں کو کیا لکھوں   کہ سچ کے خوف سے لرزاں ہیں خامہ و قرطاس

کہ ہو چکا ہے بشر کا ضمیر بے غیرت   کہ کٹ چکی ہے زمانے کی شہ رگِ احساس

فضول سارے توانینِ لغو سب تاریخ   نشے میں دشمنیِ حق کے گم ہیں ہوش و حواس

نہیں ہے تاب کسی میں بھی سچ کے سننے کی   مشاہدہ ہے شب و روز کا، نہیں یہ قیاس

رئیسؔ لوگوں کی باتوں سے صاف ظاہر ہے

بھرا ہوا ہے دماغوں میں سر بسر خناس

٭ مرکز مطالعات فارسی۔ ۴/۱۱۸، لوکو کالونی، علی گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

نقش ہائے رنگ رنگ

(مطالعات غالب) از پروفیسر اسلوب احمد انصاری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۴، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب (ماتا سندری لین) نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

غالبیات کے ذخیرے میں یہ اہم اور قابل قدر مجموعۂ مضامین دراصل اس احساس کا نتیجہ ہے کہ "کلام غالب کی اندرونی توانائیاں اتنی وافر ہیں کہ وہ ابھی تک بحر کمال حیطۂ امکاں میں نہیں لائی جاسکی ہیں"۔ فاضل مصنف مجلہ نقد و نظر کے اڈیٹر، انگریزی ادبیات کے استاد و مصنف ہیں، اقبالیات ان کا خاص موضوع ہے اور اردو کے ممتاز غالب شناسوں میں ان کا شمار ہے، غالب پر ان کی تحریریں 'غالب نامہ' اور دوسرے مجلوں میں شایع ہوتی رہتی ہیں، مطالعہ اور فکر و نقد کے اعلیٰ معیار و مذاق کے سبب یہ تمام مضامین غالب کے ذہن و فن، کلام کی خصوصیات، دوسرے اہم شعراء سے موازنے اور بعض غالب شناسوں کی تعبیر و تفہیم میں قدر کی نظر سے دیکھے گئے، اب غالب انسٹی ٹیوٹ نے ان سولہ[16] مضامین کو کتابی شکل میں سنوار کر پیش کیا ہے، ان میں غالب کے فن کے عنوان سے پہلا مضمون زیادہ جامع اور گویا ایک متن ہے جس کی تفصیل و تشریح باقی مضامین سے ہوتی ہے، جن میں غالب کے شعری محرکات، استعارہ، استفہام، تشکیک وغیرہ شامل ہیں، فارسی کلام اور مثنوی ابر گہربار اور چراغ دیر کے علاوہ مومن و اقبال اور حالی و بجنوری اور خطوط غالب میں "نفس" کی

پرچھائیوں کے عنوان سے بھی ایک مضمون ہے، مغربی اور مشرقی لب و لہجہ کی آمیزش نے فاضل مصنف کے اسلوب کو ایک خاص رنگ دیا ہے، بعض طبائع پر شاید یہ رنگ گراں بار ہو تاہم مطالعہ کی گہرائی اور عالمانہ تنقیدی بصیرت ان کی تحریر کا جوہر ہیں، استعارہ و تشبیہ کے سلسلے میں رمز بلیغ کی صنعت و صفت کی یافت اور اس کے اثبات میں ان کے دلائل و شواہد کی بحث پڑھنے کے لایق ہے، ان کا یہ قول بھی قابل لحاظ ہے کہ غالب کا کلام ہندی مغل تمدن کی روح کا عکس پیش کرتا ہے، انہوں نے اس اجمال کی توضیح بھی کی ہے، غالب کے بعض پسندیدہ الفاظ و تعبیرات مثلاً شعلہ، جنون، وحشت، مستی وغیرہ اور ان کی دو غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ بھی ان کی تنقیدی بصیرت کا عمدہ ثبوت ہے، غالب کی اردو اور فارسی شاعری کا بنیادی فرق ان کی نظر میں یہ ہے کہ فارسی غزل میں روایت کی پاسداری ہے جب کہ اردو میں آزادہ روی اور اجتہاد کی کارفرمائی ہے، اس اعتراف کے باوجود کہ غالب کے ایسے بے شمار اشعار ہیں جن کی معنویت اور فنی لطافت ذہن انسانی کو دعوت فکر دیتی ہے، وہ اقرار کرتے ہیں کہ غالب کا کوئی نظام فکر و فلسفہ یا زندگی کی کوئی تفسیر مکمل نہیں جب کہ اقبال کے ہاں ایک مربوط نظام فکر ہے اور ان کی شاعری ایک مابعد الطبیعاتی سطح رکھتی ہے، اقبال کی شاعری کا کینوس زیادہ وسیع ہے اور اسی لئے اقبال کو غالب پر فوقیت حاصل ہے، ان کے خیال میں جدید اردو شاعری کے رنگ و آہنگ پر غالب کا اگر کوئی اثر پڑا ہے تو وہ اقبال ہی کے توسط سے آیا ہے۔ غالب و مومن کا موازنہ بھی بڑا عالمانہ اور متوازن مطالعہ و اسلوب کا آئینہ ہے غالب نے اپنے ماخذ شعری میں صائب، بیدل اور حافظ کا ذکر نہیں کیا ہے، اس کے متعلق فاضل مصنف نے لکھا کہ "ان کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے"، لیکن اس دعویٰ کے لئے قیاسات اور مفروضوں کی جگہ کوئی واضح دلیل شاید زیادہ بہتر ہوتی۔ حالی کے ذکر میں مولوی محمد حسین آزاد

اور علامہ شبلی کے متعلق ان کی رائے دلچسپ بھی ہے اور محل نظر بھی، خصوصاً شعرالعجم کے متعلق ان کا خیال اس لائق ہے کہ اس کو بحث کا موضوع بنایا جائے، غالب کی تصویر دیکھ کر خودی کے گہرے احساس کا تاثر ٹھیک ہے لیکن دیوزادوں جیسی فہم و فراست اور قوت فیصلہ پائے جانے کا تاثر ناقابل فہم ہے۔ ادارہ غالب انسٹی ٹیوٹ اس عمدہ کتاب کی اشاعت کے لئے قابل مبارکباد ہے، البتہ املا و کتابت کی یہ غلطیاں مابہ الامتیاز اور غیض کھٹکتی ہیں۔

اتباع سنت نبوی اور ترک تقلید شخصی المعروف بہ طریق محمدی از مولانا محمد صاحبؒ جوناگڑھی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۳۱۸، قیمت ۹۰ روپے، پتہ: اہل حدیث اکیڈمی، مرزا ہادی پورہ، چوک مئوناتھ بھنجن۔ یوپی۔

مولانا محمدؒ جوناگڑھی ممتاز علمائے اہل حدیث میں تھے، اپنے فکر و مسلک کی اشاعت اور اس راہ میں احناف اور دیگر مکاتب فقہ کے رد میں انہوں نے خاصی تحریریں سپرد قلم کیں، اب مئو کی دارالحدیث اکیڈمی ان کو از سر نو شائع کرنے میں مصروف ہے زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں سنت پر عمل، حب نبویؐ کی علامت و اہمیت، ترک تقلید اور خاص طور پر فقہائے حنفیہ کے رد کو موضوع بنایا گیا ہے، مسلکی اختلافات کے مطالعے کا شوق رکھنے والوں کے لئے اس کتاب میں دلچسپی کا سامان ہے، مناظرانہ بحثوں کا اپنا ایک خاص رنگ ہوتا ہے، جہاں جواب اور جواب الجواب کے امکانات کے در ہمیشہ وا رہتے ہیں اثنائے بحث شدت جذبات اور زور کلام میں زبان و دہن کے بگڑنے کا موقع بھی رہتا ہے، لیکن اس کتاب کی یہ خوبی ہے کہ عموماً زبان شائستہ اور لہجہ دردمند ہے اور یہ بہت غنیمت ہے، کتاب کے لائق محشی نے احادیث و روایات کی تخریج اور مراجعت محنت سے کی ہے، لیکن ان کی ابتدائی تحریر میں کچھ جوش بھی ہے "فریب پسند حیلہ جو، مفتی و شیخ الحدیث کے خوشنما لبادے کے ساتھ خم ٹھونک کر میدان میں کود پڑے"۔ ان الفاظ کے بغیر بھی بات کہی جاسکتی ہے۔

وقار ہنر از جناب وقار مانوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۱۶۰، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: مکتبہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶۔

جناب وقار مانوی کے کلام میں اوصاف و محاسن شعری کی کمی نہیں، وہ جناب مانی جائسی جیسے استاذ فن کے تلمیذ رشید ہیں، نام و نمود سے نفور اور طبعی عزلت پسندی اور خودداری طبیعت کی وجہ سے ان کو عوامی شہرت زیادہ نہیں حاصل ہوئی، لیکن ناقدوں اور قدردانوں میں وہ نیک نام ہیں، اس سے پہلے وقار سخن اور وقار آگہی کے نام سے ان کے دو مجموعے شائع ہوکر داد تحسین سے سرفراز ہو چکے ہیں، اب سخن و آگہی کا سفر مرحلہ ہنر میں داخل ہو چکا ہے، زیر نظر مجموعہ اس کا ثبوت ہے، جس میں انقلاب زمانہ کے کرب اور روبہ زوال تہذیب کے مرثیہ و نوحہ کے ساتھ حسن و خیر کی بازیافت کی آس اور تلقین بھی ہے، معصوم لہجے نے اشعار کو پاکیزہ دیدہ و قار بنا دیا ہے جس سے کلام میں ایک تاثیر و کیفیت کا احساس ہوتا ہے، شاعر کو بھی اپنے ہنر کی آگاہی ہے۔

بلا کا رد و بدل ہے غزل کے لہجے میں مگر ہماری غزل ہے غزل کے لہجے میں

توقع ہے کہ یہ مجموعہ بھی ارباب ذوق میں مقبول ہوگا۔

بات ایک مسیحا نفس کی از جناب مولانا محمد ثناء اللہ عمری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۲۲، قیمت درج نہیں، پتہ: ادارہ تحقیقات اسلامی عمرآباد، ویلور ڈسٹرکٹ، تامل ناڈو۔

جنوبی ہند کی درس گاہ دارالسلام عمرآباد کی شہرت اور نیک نامی میں اس کے مخلص بانیوں کی پاک نیت اور اس کے اساتذہ کی محنت و لیاقت کا بڑا دخل ہے، ان حضرات کی دین داری، سادگی، ایثار اور خاموش جد و جہد نے جامعہ کو ایک نمایاں رنگ و آہنگ بخشا، جامعہ کے ایک استاذ مولانا عبدالسبحان اعظمی عمری خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کا ۱۹۹۰ء میں انتقال ہوگیا، وہ ایک مقبول

استاذ و مربی اور صاحب قلم بھی تھے، زیر نظر کتاب ان کا تذکرہ ہے جس میں ان کے اعزا، رفقا و تلامذہ کی پُراثر تحریریں شامل ہیں، فاضل مولف ایک مشاق اہل قلم اور صاحب تصانیف عدیدہ ہیں ان کا مولد و منشا خطۂ جنوب ہے لیکن ان کی تحریروں میں لکھنؤ اور اودھ کا رنگ اور لطف شامل ہے، اس کتاب میں ان کے تین مضامین ہیں جو صاحب تذکرہ کا جامع اور پُراثر مرقع پیش کرتے ہیں۔

حقوق والدین از جناب ابوصادق عاشق علی اثری، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت صفحات ۶۷، قیمت ۲۰ روپے، پتہ: مکتبہ اثریہ ۳۴۲، ابوالفضل انکلیو ۲، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

والدین کے حقوق کا علم اور شریعت مطہرہ کی اس باب میں خاص تاکید اور اطاعت و نافرمانی کی صورت میں جزا و سزا کی تلقین کی ضرورت موجودہ معاشرتی ماحول میں اور سوا ہوگئی ہے اس کتاب میں قرآن مجید اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں تقریباً سارے احکام نقل کردیے گئے ہیں، اطاعت والدین کی اہمیت و فرضیت، فیوض و برکات نافرمانی اور اس کا انجام کے عنوان کے تحت ان تمام روایتوں کو سلیقے سے یکجا کیا گیا ہے، غیر مسلم والدین کے حقوق کا بھی ذکر ہے، اصل عبارتوں کے ساتھ ان ترجمے اور مراجع و مصادر کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

گلہائے رنگ رنگ از جناب ارشد علی انصاری اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۷۷، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: گہوارۂ ادب ۱/۷/۱۰، کانسٹھ ٹولہ محمد آباد، ضلع مئو۔ یوپی۔

خواجہ حسن نظامی، علامہ اقبال سہیل، یحییٰ اعظمی اور ابوعلی اثری مرحوم جیسے ادیبوں اور شاعروں کے خاکوں کے علاوہ چند اور مفید مضامین کا یہ مجموعہ لائق مصنف کی تحریری صلاحیت کا غماز ہے، وہ کتب خانہ دارالمصنفین کے خاص رکن جناب ابوعلی اثری کے صاحبزادے ہیں جن کے سایہ عاطفت کا اثر ان کی تحریر سے نمایاں ہے، توقع ہے کہ اپنے والد مرحوم کی حیات اور ان کی علمی و ادبی خدمات کا مرقع تیار کرنے کی سعادت بھی ان کو حاصل ہوگی۔

ع۔ص